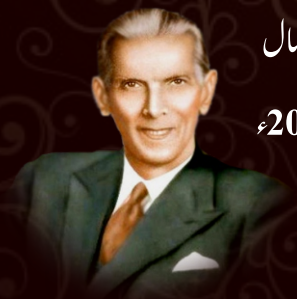
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چھہترواں سال



ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

دسمبر 2019ء



علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

قائداعظم محمد علی جناحؒ

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا ذریعہ قرآن مجید کے اصول اور احکام ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پالیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے اصول متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں، قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

(عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن، اورینٹ پریس،
بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، 8 جنوری 1942ء)



طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 58 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

دسمبر 2019ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 12

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
روئیداد کنونشن 2019ء	سلیم اختر	4
کیا انشورنس جائز ہے؟		8
طلوعِ اسلام نے کیا دیا؟	ڈاکٹر سید عبدالودود (مرحوم)	11
قائداعظمؒ کا خط گاندھی کے نام	ادارہ	19
ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق	ڈاکٹر طاہرہ اکرم، گجرات	23
ادارہ طلوعِ اسلام کنونشن تصویری جھلکیاں	ادارہ	26
حج کو ایک متحرک ادارہ کیسے بنایا جائے	خالد بشیر فاروقی، لاہور	34
آیئے دیکھتے ہیں آئینہ قرآنی میں	خورشید انور، سوات	37
ان شاء اللہ	جمیل احمد عدیل	40
اسلامی مملکت اور صفاتِ خداوندی	خواجہ ازہر عباس، کراچی	50

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

سلیم اختر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سالانہ کنونشن طلوعِ اسلام

منعقدہ 27 اکتوبر 2019ء بمقام لاہور کی روئیداد

طلوعِ اسلام کا سالانہ کنونشن 2019ء دو روزہ 26 اور 27 اکتوبر کو منعقد ہوا۔ احبابِ قرآنی کے قافلے جمعہ کے روز ہی پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ 26 اکتوبر بروز ہفتہ صبح 10 بجے جنرل کونسل کا اجلاس شروع ہوا تو نمائندگانِ بزم ہائے طلوعِ اسلام لائبریری حال میں مجتمع ہو گئے۔ جبکہ اراکینِ بزم ہائے طلوعِ اسلام باہر صحن میں ایک ورکشاپ کے لئے تیار ہو گئے جس کی میزبانی محترم عاطف طفیل صاحب کر رہے تھے۔ لنچ کے بعد نہایت سنجیدہ اور فکری مقالات وخطبات کا سلسلہ شروع ہُوا۔ ابتداءً محترم عابد حسین صاحب رُکن بزم طلوعِ اسلام راولپنڈی نے آئی ٹی کے میدان میں تحریکی پراگرس رپورٹ پیش کی جو کہ بہت حوصلہ افزاء تھی۔ بعد ازاں محترم اعجاز رسول صاحب نے نہایت پُرفکر مفصل گفتگو سے نوازا۔ ان کے بعد شاہ ریاض صاحب نے ایک پریذنٹیشن دی۔ بعدہٗ بریگیڈیئر تیمور افضل خان صاحب نے اقبال اور مارکسزم کے موضوع پر بڑا پُرمغز مقالہ پیش کیا جسے حاضرین نے صبر وتحمل کے ساتھ سماعت کیا۔ اس کے بعد محترم ڈاکٹر صدیق اکبر صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ان کے بعد محترم ڈاکٹر حامد اے میاں نے نہایت تفصیل کے ساتھ ''خود'' پر اعتماد واعتقاد بڑھانے والی گفتگو فرمائی۔ اس طرح یہ سلسلہ عشاء کے بعد تک جاری رہنے کے بعد اختتام پذیر ہوا۔ ادارہ طلوع اسلام کی کنونشن 2019ء کے سالانہ اجلاس کے دوسرے دن کا آغاز مقررہ وقت 10 بجے صبح ادارہ کے چیئرمین محمد اکرم راٹھور صاحب کی زبان سے تلاوتِ قرآن اور کلامِ اقبال سے ہوا۔ اُن کا بڑھاپے میں بھی ترنم اور جوش سے پیش کرنے کا ایک اپنا ہی منفرد انداز ہے، جو اُنہوں نے طبیعت کی خرابی کے باوجود محبت بھرے جوش سے پیش کرتے ہوئے سامعین کو بے ساختہ داد دینے پر آمادہ کر دیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے شرکاء کو خوش آمدید کہتے ہوئے ادارہ کی کارکردگی کا مُختصر جائزہ بھی لیا۔

اِس کے فوری بعد محترم ارشد اقبال نے محترم عارف بٹالوی کا کلام پیش کیا، جو اُنہوں نے اپنے بھائی اور ہمارے بابا جی محترم پرویز صاحب کی وفات پر لکھا تھا۔

اِس کے بعد ہمارے ہر دلعزیز محترم عمر، نمائندہ لاہور بزم اور سٹیج سیکرٹری نے اپنے بھرپور مخصوص والہانہ انداز میں باری

باری درجِ ذیل احباب کو پکار کر سٹیج پر آ کر دعوتِ خطاب دی۔

1۔محترم خورشید انور، نمائندہ بزمِ سوات وادارہ کے وائس چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام

2۔محترم خالد فاروقی، لاہور۔

3۔محترم اطہر محمود، کراچی

4۔ڈاکٹر اعجاز رسول، نمائندہ بزمِ لنڈن

5۔ڈاکٹر شاہ ریاض، رُکن بزم لنڈن

6۔محترم شکیل مُغل، لاہور

7۔پروفیسر ڈاکٹر صالحہ نغمی نمائندہ بزمِ لاہور خواتین

8۔محترم طارق مصطفیٰ سابقہ وفاقی سیکریٹری حکومتِ پاکستان، اسلام آباد

9۔محترم عقیل حیدر، نمائندہ بزمِ فیصل آباد

10۔ڈاکٹر طاہرہ اکرم، گجرات

11۔محترم ممتاز خاں، کینیڈا

12۔ڈاکٹر پروفیسر فریدالدین، لاہور

13۔ڈاکٹر حامد اے۔میاں، وائس چیئرمین ادارہ طلوعِ اسلام

آخر میں ڈاکٹر انعام الحق نے اپنے خطبہِ صدارت میں واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ تحریکِ طلوع اسلام پر جو الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ قرآنِ خالص کے نظریات کی تبلیغ کرتے وقت صرف قلب ونگاہ میں اِنقلاب لانے کی باتیں کرتے ہیں اور اُن کے عملی شکل کے نفاذ پر عمل کرتے دِکھائی نہیں دیتے۔جب تک قرآنی تعلیمات پر عملی شکل کا آغاز نہ کیا جائے، تو ہمارا قرآنی نظام کے قیام کا خواب ادھورا ہی رہے گا۔اِس لئے اُن کی نظر میں تحریکِ طلوع اسلام کی کاوشوں کو ایک وعظ کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنے خُطبہ صدارت میں اِس پر کُھل کر بات کر کے اِس اعتراض کا تجزیہ لیتے ہوئے ادارہ طلوع اسلام کا واضح مؤقف سامعین کے سامنے رکھا۔اُنہوں نے قرآن کی تبلیغی کاوشوں کو وعظ کا نام دینا قرآنی تعلیم سے ناسمجھی قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ طلوع اسلام کی کاوشیں ہر زاویہ نگاہ سے عمل کے میدان میں آتی ہیں۔ادارہ طلوع اسلام کا شروع ہی سے واضح مؤقف رہا ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک خارجی دنیا (یا نظام) میں کوئی صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اس تبدیلی کی متمنی جماعت کے افراد کے قلب ونگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق تبدیلی پیدا نہ ہو۔وہ قلب ونگاہ کی اس داخلی تبدیلی کو انقلاب قرار دیتا ہے۔قلب ونگاہ میں اس قسم کی تبدیلی کا کام ایک دن کی بات نہیں۔یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت طلب بھی

ہوتا ہے اور کافی وقت کا متقاضی بھی۔ اس مرحلہ میں صبر طلبی ہی دشوار نہیں ہوتی بلکہ قلب ونگاہ میں تبدیلی پیدا کرنے کا یہ مرحلہ بڑا غیر مرئی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ اس میں بظاہر نہ کوئی حرکت نظر آتی ہے نہ حرارت۔ اس لئے سطح بین نگاہیں اسے ''بے عملی'' سے تعبیر کر دیتی ہیں اور ان کے اس طعن سے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود اس جماعت کے زیر تربیت افراد، اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دنیا بہت آگے نکلے جا رہی ہے اور ہم یونہی اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن قرآنی جماعت نہ اغیار کے اس قسم کے طعنوں سے متاثر ہوتی ہے نہ خود اپنے اندر کے افراد سے مصالحت کی خاطر اپنا راستہ بدلنے کے لئے تیار۔ یہ جسے آپ اسلامی مملکت کہتے ہیں، وہ کوئی مکینکل چیز نہیں ہے کہ آپ قانون سازی کر دیں اور مملکت چلتی رہے۔ اسلامی مملکت کو چلانے سے پہلے انسان سازی کرنا ہوتی ہے۔ یہ قانون سازی کی بات نہیں ہے، یہ تو انسان کے اندر ایک نفسیاتی تبدیلی ہے، شخصیّت کی تبدیلی ہے، یہ تو سیرت کی تبدیلی ہے، یہ تو قلب ونگاہ کی تبدیلی ہے، جو قرآن کی تعلیم کر دیتی ہے۔ یہ تبدیلی آجائے تو پھر اسلامی قوانین اپنے نتائج برآمد کریں گے، ورنہ محض قانون سے تو کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکے گا۔

خود نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ مومنین کی مکی زندگی کے تیرہ سالہ طول طویل (اور بظاہر بے حس وحرکت) مدت اس صبر طلبیٔ عشق کی مظہر تھی۔ جب اس جماعت کے افراد میں قلب ونگاہ کی ایسی تبدیلی اور سیرت وکردار میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس نظام کے قیام کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے اور اس میں کوئی حربہ ایسا استعمال نہیں کرتی جسے قرآن فساد قرار دیتا ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی نظام کے بتدریج قیام کے اعلان کے عمل میں ترتیب وار درجِ ذیل پانچ مراحل میں طے کرنے کی نشاندہی کی۔

1۔ عجمی اور مترفین کی سازشوں سے قرآن کے الحق کے پیغام میں باطل سے کی گئی تحریف کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن کی روشنی میں ہی اس کی جگہ قرآنِ خالص کی تعلیم پیش کرنا، جو ادارہ طلوع اسلام کر رہا ہے۔

2۔ قرآنِ خالص کی تبلیغ کا آغاز اپنے گھر، محلہ، شہر اور مُلک سے کرتے ہوئے، اِسے پوری نوعِ انسانی کے سامنے غور و فِکر کے لئے پیش کرتے ہوئے قلب ونگاہ میں تبدیلی سے ایمان لانے کی دعوت دینا اور یہ فریضہ بھی پہلے فریضہ کے ساتھ ساتھ طلوع اسلام نبھانے کی کاوشوں میں لگا ہوا ہے۔

قرآن کے پیغامِ توحید کی دعوت پر بِلا جبر واکراہ اپنی مرضی سے ایمان لانے والے اِفراد کا ایک جماعتِ مومنین کی تشکیل کر کے ایک قوت بنانا۔ جماعتِ مومنین کی تعلیم وتربیت سے اُن کے ایمان کو مزید تقویت دیتے ہوئے اِسے مومنِ حقاً بناتے ہوئے قیامِ مملکتِ اسلامیہ کی راہ میں پیش آنے والی ہر قسم کی مُشکلات اور مصائب کا سامنا کرنے کی تقویت پیدا کرنا۔ اِن بتدریج مراحل کو عبور کر کے ہی مملکتِ اسلامیہ کے قیام کا اعلان کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے وضاحت کی کہ یہ سبھی عمل کے ارتقائی مراحل ہیں، جن کو ترتیب وار باری باری طے کر کے ہی لوگ بِلا

جبر و اکراہ اپنی مرضی سے سفر طے کرتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ جب تک پہلی منزل پوری کامیابی سے طے نہ کر لی جائے، دوسری منزل میں قدم رکھنے کا نہ صرف کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہمیں ہر وقت ذہن میں رکھنا ہوگا کہ دوسری منزل میں قدم رکھنا تبھی ممکن گردانا جائے گا، جب آپ نے پہلی منزل کا سفر کامیابی سے طے کرلیا ہو۔ ہمارے تعلیمی نظام میں بھی پہلی کلاس میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ہی اگلی کلاس میں داخلہ دیا جاتا ہے۔ اِس ضِمن میں دیکھا گیا ہے کہ منزلِ مقصود کے حصول کا آغاز سے کیا جاتا ہے۔ اِس ضِمن میں ہماری پہلی عمل کی منزل یہی ہے کہ عجمی اور مترفین کی سازشوں سے قرآن کے الحق کے پیغام میں باطل سے کی گئی تحریف کی نشاندہی کرتے ہوئے قرآن کی روشنی میں ہی اِس کی جگہ قرآنِ خالص کی تعلیم کو پیش کیا جائے۔

ہم پھر دُہرا دیتے ہیں کہ ہماری تحریکِ طلوعِ اسلام کا سوچ بچار کے بعد یہی موقف ہے کہ قرآنی معاشرہ کے قیام کی کاوشوں کا آغاز پہلی اور دوسری منزل سے شروع کیا جائے۔ اِس تحریک کا یہ بھی موقف ہے کہ جب تک اِن منازل کو کامیابی سے طے نہیں کرلیا جاتا، تب تک مقصد کے حصول میں آگے بڑھنا بے سود ہوگا۔ اِس لئے اِن منازل کو طے کرنے کے لئے پوری قوت لگانی ہوگی، اِس لئے کہ یہ منازل محض وعظ کے لئے باتیں بنانے کی نہیں بلکہ عمل اور وہ بھی کٹھن ترین عمل کا میدان ہے۔ اسمیں آرام نہیں کیا جاسکتا اور کسی قسم کی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اِس میں کسی قسم کا شک نہیں ہونا چاہیئے کہ اِن منازل کے حصول کے بعد ہی ہم ٹیک آف یعنی اُڑان کی پوزیشن میں آسکتے ہیں۔ لہٰذا ہم پوری توجہ اور دِلجمعی سے اِس کام میں لگے ہوئے ہیں اُمید رکھتے ہیں کہ یہ طریقہِ کار نہ صرف حال بلکہ مستقبل میں بھی خوشگوار نتائج لانے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

سانحہ ارتحال

انتہائی دکھ و افسوس سے عرض ہے کہ بزم مینگورہ سوات کے ایک دیرینہ اور فعال کارکن غلام جیلانی ساکن مینگورہ وفات پا گئے۔ مرحوم ایک انتہائی مخلص، نڈر اور خدمت گار انسان تھے۔ ادارہ طلوع اسلام اور طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب و رسائل پہلے ان کے نام آیا کرتے تھے اور پھر ان کے دوکان سے ساتھی لے جاتے تھے۔

مرحوم و مغفور کی جدائی بزم طلوع اسلام سوات کیلئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالی مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں بلند مقام عطاء فرمائیں۔ اور ورثاء کو صبر جمیل عطاء فرمائیں۔

غم گسار

ادارہ طلوعِ اسلام و خورشید انور نمائندہ بزم طلوع اسلام مینگورہ/وائس چیرمین ادارہ طلوع اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا انشورنس جائز ہے؟

جوں جوں معاشی تقاضے بڑھتے جاتے ہیں، اس قسم کے استفسارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے کہ بینک کا سود جائز ہے یا ناجائز، زمین بٹائی پر دی جاسکتی ہے یا نہیں، روپیہ لگا کر منافع میں حصہ دار بننا کیسا ہے، پراویڈنٹ فنڈ کا منافع لیا جاسکتا ہے یا نہیں، انشورنس جائز ہے یا نہیں۔۔۔ ہم وقتاً فوقتاً ان استفسارات کا جواب ان صفحات میں دیتے رہتے ہیں۔ اور قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اپنی کتاب۔۔۔ خدا اور سرمایہ دار (ایڈیشن اوّل، اکتوبر 1967ء) میں تفصیلی بحث بھی کر چکے ہیں۔ لیکن پچھلے ماہ انشورنس کے متعلق دو تین استفسارات موصول ہوئے ہیں اور ان کا تقاضا ہے کہ اس پر متعین طور پر لکھا جائے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل متعدد بار لکھ چکے ہیں، بات بینک کے سود، مضاربت، مزارعت، انشورنس وغیرہ کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام ہی غیر قرآنی ہے اور ہم چاہتے یہ ہیں کہ کسی طرح اس غیر اسلامی نظام میں ''اسلام'' کا پیوند لگا کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیں۔ یہ اطمینان فریب نفس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کوئی غیر اسلامی نظام، پیوند سازی سے اسلامی نہیں بن سکتا۔ لہٰذا، غیر اسلامی نظام معیشت کو علیٰ حالہ رکھتے ہوئے، اس قسم کی بحثیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتیں۔ اگر قرآن کا معاشی نظام قائم ہو جائے تو اس میں، ان میں سے کوئی سوال بھی پیدا نہیں ہوگا۔ آج ان سوالات کی نوعیت اسی قسم کی سمجھئے جیسے (مثلاً) ایک کمیونسٹ، نظام سرمایہ داری کے تحت زندگی بسر کرتے ہوئے پوچھے کہ میں ذاتی جائداد بنا سکتا ہوں یا نہیں؟

آپ انشورنس ہی کو لیجئے۔ اس کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ ایک شخص سوچتا ہے کہ اگر کل کو اس پر کوئی حادثہ گزر جائے تو اس کا (یا اس کی موت کے بعد، اس کے بچوں کا) کیا بنے گا؟ قرآن کے معاشی نظام میں کسی شخص کو اس قسم کا خطرہ لاحق ہو ہی نہیں سکتا۔ اس نظام میں ہر ذی حیات کے سامان زیست (بنیادی ضروریات زندگی) بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے، اس لئے اگر کوئی شخص کسی وجہ سے کام کرنے سے معذور ہو جائے تو اسے اس کی فکر ہی نہیں ہوگی کہ وہ کھائے گا کہاں سے یا اگر وہ وفات پا جائے تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا۔ لہٰذا، اس نظام میں انشورنس کی نہ ضرورت لاحق ہوتی ہے، نہ ہی اس کے جائز اور ناجائز ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ہر فرد اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے مستقبل کے متعلق ہر طرح سے (Assured) ہوتا ہے۔

لیکن آج (غیر اسلامی نظام معیشت میں) صورت یہ ہے کہ اگر کوئی فرد کاسب، کسی وجہ سے کام کاج کرنے سے معذور ہو جاتا ہے، یا اس کی موت ایسے حالات میں ہو جاتی ہے کہ اس کے پاس اثاثہ کوئی نہیں ہوتا، تو وہ خود اور اس کے بیوی بچے نان شبینہ تک کے محتاج ہو جاتے ہیں اور ان بیچاروں کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ غیر قرآنی نظام معیشت (یعنی نظام سرمایہ داری) میں اس صورتحال سے بچنے کے لئے انشورنس کی اسکیم رائج کی گئی۔ اس سے، بہرحال، اس قسم کے واقعات میں، زندگی کے دن

بسر کرنے کے لئے ایک سہارا مل جاتا ہے۔ اندریں حالات، موجودہ نظام میں، اس اسکیم کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ لیکن

شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

یعنی یہ حضرات (ہمارے مذہبی پیشوا) بجائے اس کے کہ موجودہ نظام کو حرام قرار دیں، اس کے اندر اس قسم کی سہولتوں کو حرام قرار دے دیتے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے کہ صاحب! اگر یہ شخص انشورنس نہ کرائے اور کل کو اس پر اس قسم کا حادثہ گزر جائے تو اس کا اور اس کے بال بچوں کا کیا بنے گا، تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ بتانا ہمارا کام نہیں۔ ہمارا کام تو فتویٰ دینا ہے۔۔۔ یہی سوال قرآن کریم نے بھی اٹھایا تھا جب کہا تھا کہ:

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (2:266)

کیا تم میں سے کوئی شخص بھی یہ چاہے گا کہ:

(1) اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا سرسبز و شاداب باغ ہو جس میں پھل بکثرت آئیں۔

(2) وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔

(3) کہ ایسے میں ایسی بادِ سموم چلے کہ اس باغ کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے (اور اس طرح وہ پورے کا پورا کنبہ سامان زیست سے محروم رہ جائے)۔

(4) کیا تم میں سے کوئی بھی چاہے گا کہ اس کی ایسی حالت ہو جائے؟ اگر ایسا نہیں چاہتے تو پھر فکر و تدبر کی رو سے دیکھو کہ وہ کونسا قدم اٹھایا جائے جس میں ایسی صورت پیدا نہ ہو۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ قرآن نے اس کا اعتراف کرانے کے بعد (کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں چاہے گا) کہا کہ پھر تم ایسی آفت سے بچنے کا انتظام کیوں نہیں کرتے! اور وہ انتظام یہ ہے کہ تم قرآن کا تجویز کردہ معاشی نظام اپنے ہاں رائج کر لو۔ اس نظام میں کبھی ایسی شکل پیدا نہیں ہوگی۔

قرآن کریم نے اس کا یہ حل بتایا اور رسول اللہ ﷺ نے ایسا نظام قائم کر کے دکھا دیا کہ یہی ان مشکلات کا قرار واقعی حل ہے۔

وہ نظام باقی نہ رہا اور دنیا میں نظام سرمایہ داری کا چلن عام ہو گیا۔ اس نظام میں بھی وہی سوال سامنے آیا جسے قرآن سامنے لایا تھا۔ اس نظام کے حاملین نے اس کا حل انشورنس کی صورت میں تجویز کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ حل ویسا نہیں جیسا قرآن کریم نے تجویز کیا تھا، لیکن موجودہ غلط نظام میں یہ حل، جب تک قرآنی حل ممکن نہ ہو بہرحال غنیمت ہے اور دنیا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے ہاں قرآنی حل رائج نہیں کرتے اور دنیا نے جو حل تجویز کیا ہے، اسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیتے ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔

قرآن نے (مندرجہ بالا آیت میں) کہا تھا کہ تم سوچو کہ تمہیں کیا انتظام کرنا چاہیے، جس سے ایسی صورت پیدا ہو سکے۔ لیکن ''مولوی صاحبان'' کا ارشاد ہے کہ شریعت کے معاملہ میں سوچنا حرام ہے۔

انشورنس کو ناجائز قرار دینے کے لئے، ان حضرات کی طرف سے دو دلائل پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ چیز ''توکل علی اللہ'' کے خلاف ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس میں سود شامل ہوتا ہے۔

جہاں تک ''توکل علی اللہ'' کا تعلق ہے، ان حضرات نے توکل کا ایسا غلط مفہوم پیش کر رکھا ہے جس سے یہ قوم اپاہجوں اور مفلوجوں کا گروہ بن کر رہ گئی ہے۔ ان کے پیش کردہ توکل علی اللہ کے مفہوم کی تردید تو روزمرہ کے واقعات کر رہے ہیں۔ اگر توکل علی اللہ سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے لئے کوئی حفاظتی تدبیر نہ کرو، کیونکہ رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے، تو ان سے پوچھئے کہ یہ جو اس وقت دنیا کی آدھی آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے اور ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان بھوک سے مر جاتے ہیں یا فردِ کا سب کی موت کے بعد، اس کے بیوی بچوں پر فاقے آنے شروع ہو جاتے ہیں، تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟ یاد رکھئے! توکل علی اللہ کے یہ معنی نہیں۔ اس کے معنی ہیں خدا کے تجویز کردہ نظام کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد۔ یہ بھروسا کہ اس نظام میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی ذی حیات بھوکا رہ جائے۔ یہ اسی نظام کی محکمیت تھی جس کے پیش نظر حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ:

''اگر کسی بستی میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو جائے تو اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔''

یا جس ''ذمہ داری'' کی حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں تشریح کی تھی کہ:

''اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو بخدا! عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔''

باقی رہا سود کا معاملہ۔۔۔ سو ان حضرات سے پوچھئے کہ آپ، لوگوں سے ''کارِ خیر'' کے لئے جس قدر عطیات لیتے ہیں (حتیٰ کہ جس وظیفہ یا تنخواہ پر آپ کی بسر اوقات ہوتی ہے) کبھی سوچا بھی ہے کہ اس میں کس قدر حصہ سود کا ہوتا ہے؟ سود، موجودہ نظامِ سرمایہ داری کا خونِ رگِ حیات ہے۔ اس سے (اس نظام میں زندگی بسر کرنے والوں میں سے) کس کو مفر ہو سکتا ہے؟

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ موجودہ نظامِ معیشت سراسر غیر اسلامی ہے اور سود، انشورنس وغیرہ قسم کی اسکیمیں اس نظام کا لازمی جزو ہیں۔ لہٰذا، جب تک آپ اس نظام کو گوارا کئے ہوئے ہیں، آپ کو اس شجرۃ الذقوم کے برگ و بار کو بھی گوارا کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ انہیں گوارا نہیں کر سکتے اور رزقِ حلال کے متمنی ہیں تو اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ، قرآنی نظامِ معیشت رائج کریں۔ لیکن اگر ہماری روش یہی رہی کہ موجودہ نظامِ سرمایہ داری کو تو عین مطابق اسلام قرار دیتے رہے اور اس کے برگ و بار کو حرام، (اور قرآنی نظام کی طرف دعوت دینے والوں کو مرتد قرار دے کر مطعون کرتے رہے) تو یہ فریبِ نفس ہے جس سے عملی مشکلات کا حل نہیں مل سکتا۔

(مطبوعہ ماہنامہ طلوعِ اسلام، اگست 1968ء)

ڈاکٹر سید عبدالودود (مرحوم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طلوعِ اسلام نے کیا دیا؟

یہ وہ حقیقت کشا اور حیات انگیز خطاب ہے جو 19 اپریل 1959ء کی شب کو ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ایم۔سی مرحوم و مغفور نے طلوع اسلام کنونشن میں دیا۔ خلوص میں ڈوبی ہوئی مردِ مجاہد کی یہ آواز ایوان کو فکر و نظر کی ان گہرائیوں میں لے گئی جہاں زندگی، اس کے مقاصد، اور جانکاہ فرائض بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں۔ خود پرویز صاحب اس خطاب کے دوران میں تاثر میں ڈوبتے چلے گئے اور خطاب کے خاتمے پر نعرۂ تحسین بلند کرتے ہوئے اسٹیج پر آئے اور ڈاکٹر صاحب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ملت قابل مبارک ہے کہ اس میں ایسے فکر خالص رکھنے والے مردِ مجاہد موجود ہیں اور یہ کہ وہ خود کو بالخصوص قابل مبارکباد سمجھتے ہیں کہ ان کے پیش کردہ قرآنی فکر کے سمجھنے والوں میں ڈاکٹر موصوف جیسے مخلص اور مجاہد بھی شامل ہیں۔

جن اصحاب کو طلوع اسلام کے ساتھ دلچسپی ہے میں ان سے اکثر سوال کرتا ہوں کہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں وہ کونسی چیز ہے جو آپ کو پسند ہے۔ مختلف لوگوں کے مختلف جواب ہوتے ہیں۔ بعض بہنیں یہ کہتی سنی گئی ہیں کہ ''طاہرہ کے نام خطوط'' میں جو عائلی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے وہ بے نظیر ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''سلیم کے نام خطوط'' کا انداز بڑا دلکش ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ''انسان نے کیا سوچا'' میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ اکثریت ان احباب کی ہے جو ''نظام ربوبیت'' کے دلدادہ ہیں۔ ایک صاحب نے جو طلوع اسلام کی اکثر مخالفت کرتے ہیں لیکن جب مجھ سے ملتے ہیں تو انداز گفتگو ذرا مختلف ہوتا ہے کہا کہ ہاں ''معراج انسانیت'' میں جو مستشرقین کی آراء رسول اللہ ﷺ کے متعلق اکٹھی کی گئی ہیں وہ بڑی دلچسپ اور قابل داد ہیں۔ ایک صاحب نے الٹا مجھ پر سوال کر دیا کہ تم خود بتاؤ کہ تمہیں طلوع اسلام کی کونسی ادا پسند ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے جس چیز نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ Attract کیا وہ اسلامی نظام کا نقشہ اور پھر نظامِ ربوبیت ہے لیکن میرے خیال میں یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ہم کہتے ہیں یہ صرف ہماری اپنی اپنی میلان طبع کا اظہار ہے۔ بہتی ندی میں سے ہر ایک اپنی اپنی Capacity کے مطابق چلو بھر لیتا ہے ورنہ انسانی زندگی کا وہ کونسا پہلو ہے جس پر قرآن نے روشنی نہیں ڈالی اور قرآن کا وہ کونسا گوشہ ہے جسے طلوع اسلام نے بے نقاب نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ طلوع اسلام کا قوم پر جو سب سے بڑا احسان ہے وہ یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دی ہے۔ حضرات! آپ کو قائداعظم کا وہ واقعہ یاد ہوگا جب تقسیم ملک سے پہلے وہ ایک مرتبہ نواب بھوپال سے ملنے گئے۔ واپسی پر نواب صاحب نے قائداعظم کے ہمراہ

اپنے ایک سیکرٹری مسٹر سین کو بھیجا۔ راستہ میں اس شخص نے قائداعظم سے سوال کیا کہ جناب ملک کی فضا اس وقت خراب ہے ہر طرف افراتفری اور سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی وجہ کیا ہے؟ قائداعظم نے کہا کہ مسٹر سین آپ خود ہی بتائیے کہ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجہ ہے۔ مسٹر سین نے کہا کہ جناب میرے خیال میں قوم کے اندر Clear Thinking نہیں رہا۔ قائداعظم نے فوراً پلٹ کر جواب دیا کہ مسٹر سین میں اس وقت سیدھا بمبئی جا رہا ہوں۔ اگر واپس نواب صاحب کے پاس جانا ہوتا تو ان سے کہتا کہ وہ آپ کو ایک بہت بڑی جاگیر بخش دیں۔ حضرات! قوم کے اندر Clear Thinking کا پیدا ہونا کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج فضا بدل رہی ہے۔ بڑی تیزی سے نہ سہی بہرحال بدل رہی ہے۔ آپ پریس اور پلیٹ فارم پر تحریروں اور تقریروں کے انداز سے سمجھ رہے ہیں کہ آج سے چار پانچ سال پیشتر کی فضا کیا تھی اور آج کیا ہے۔ اس وقت ملک کا Intelligentsia اسلامی ریاست کے تصور سے کانپتا تھا۔ اخبارات میں کھلم کھلا 'اسلامی ریاست' کے خلاف مضامین شائع ہوتے تھے اور لوگوں کے مزاج میں بڑی تندی تھی۔ مثال کے طور پر میں عرض کرتا ہوں کہ 55ء میں جس وقت ہماری دوسری آئین ساز اسمبلی ایک اسلامی آئین بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی، لاہور کے ایک انگریزی ہفتہ وار نے جو کچھ لکھا تھا میں اس کے اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکیں گے کہ اس وقت اسلامی آئین کی مخالفت کی شدت کس قدر تھی۔ اس اخبار نے لکھا کہ یہ اسلامی ریاست ہے کیا؟ اور اس کی تعریف کیا ہے؟ اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ کیا یہ موجودہ جمہوری تقاضوں کو پورا کر سکے گی؟ پھر لکھا کہ یہ اسلامی ریاست کے تصور ہی کے طفیل ہے کہ عرصہ آٹھ سال سے ملک کا آئین تیار نہیں ہو سکا۔ اس اسلامی ریاست کے تصور نے دنیا کے سامنے ہمیں اضحوکہ بنا کر رکھ دیا ہے اور باہر کی دنیا کو ہم کیسے جھٹلا سکتے ہیں جب وہ ہمیں Sentimental Fools یعنی جذباتی بے وقوف کہہ کر پکارتے ہیں اور ہمیں Religious Extremists یعنی مذہبی انتہا پسند کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہبی دیوانگی خوراک ہے۔ کٹر پن وہاں کا قاعدہ ہے اور مذہب لوگوں کی افیون ہے۔

Fanaticism is the food, orthodoxy the rule and religion the dope.

پھر اس نے لکھا کہ ہم مذہبی بحثوں میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کو کافر بنانے میں اس قدر مست ہیں کہ ہم دنیا کے دیگر مسائل سے بے گانہ ہو چکے ہیں۔ فلاں چیز اسلامی ہے اور فلاں غیر اسلامی۔ فلاں مسلمان ہے اور فلاں کافر۔ اس کے سوا دنیا میں ہمیں کچھ سوجھتا ہی نہیں اور ہماری نظر مذہبی دیوانگی پر ایسی جمی ہوئی ہے کہ ہم کبھی اسلام کے پیروؤں کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے اور ہم اپنے باپ داداؤں کے کارناموں پر اس قدر مست ہیں کہ ہمیں مستقبل کی خبر نہیں۔ اس نے پھر لکھا کہ ہمارا اسلامی سال بھی رونے پیٹنے سے شروع ہوتا ہے اور کوئی دھیان نہیں دیتا کہ اس رونے پیٹنے سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ اگر ہم نے رونا ہے تو کیوں نہ ہم ان پاکستانی مسلمانوں کے لئے روئیں جو مر مر کر زندہ رہ رہے ہیں۔ جو روٹی کے ٹکڑوں اور چیتھڑوں کے لئے ترس رہے ہیں اور کیوں نہ ان کے لئے روئیں جو کام کرنا چاہتے ہیں لیکن کام نہیں ملتا اور ان

بچوں کے لئے روئیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن اس لئے نہیں کر سکتے کہ وہ زندہ باپ کے یتیم بچے ہیں اور اگر ہم نے ٹسوے بہانے ہیں تو کیوں نہ ان مریضوں کے لئے بہائیں جنہیں نہ دوا میسر ہے نہ خوراک اور کیوں نہ ان لولے لنگڑوں کے لئے بہائیں جو خستہ حالت میں سڑکوں پر پڑے ہیں۔ پھر لکھا کہ مذہبی ریاست کا تصور ہمیں وہاں لے آیا ہے جہاں ہم انسانوں کی طرح رہنا بھول چکے ہیں۔ یہ اسلامی ریاست کی تلاش جنگی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ پہلی آئین ساز اسمبلی کے بنیادی اصولوں کی سفارشات کے متعلق اس نے لکھا کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفوں کو یقین ہے کہ موجودہ جمہوری اصول پاکستان کے لوگوں کے موافق نہیں۔ یہ مسودہ پاکستان کی ذلت اور جمہوریت کی توہین ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک چیلنج ہے۔ انسانی حقوق کی نفی ہے اور آزادی کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔ یہ دوبارہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ایک مکارانہ چال ہے۔ یہ دوغلی دستاویز ہے جس میں ہر ایک اچھی چیز غائب ہے اور ہر بری چیز کی نقل ہے۔ لوگ ان دقیانوسی چیزوں کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چاہے انہیں اسلامی کہا جائے یا غیر اسلامی۔ ہم نے غیر ضروری طور پر اسلام کے گھوڑے کو اپنی سیاسی گاڑی کے آگے جوت رکھا ہے۔ حضرات! یہ تھے آج سے چار سال پہلے کے خیالات جو تعلیم یافتہ پاکستانی نوجوانوں کی ترجمانی کرتے تھے۔ اس سے آپ حضرات اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طبقہ کی اسلام سے برگشتگی ملا ازم کے خلاف کتنا بڑا Reaction ہے۔ ملا کی پریشاں خیالی کا Reaction بھی کتنا پریشان کن ہے۔ یہ تھی وہ فضا جس کو درست کرنے میں طلوع سلام مسلسل کئی برسوں سے مصروف کار رہے۔ اسی اخبار میں جس کا میں ذکر کر چکا ہوں آرٹیکل شائع ہوتے رہے جو طلوع اسلام کے خیالات کی ترجمانی کرتے رہے اور دو اور دو چار کی طرح بتاتے رہے کہ اسلامی ریاست کے متعلق جو گھناؤنا تصور پیش کیا جاتا ہے وہ کس قدر غلط ہے جس چیز کو اسلام کہہ کر پکارا جاتا ہے وہ دراصل اسلام سے کس قدر دور ہے۔ وہ ایک پردہ ہے جو اسلام اور مسلمان قوم کے درمیان حائل ہے۔ وہ اسلام کے جسم میں ایک بہتا ہوا ناسور ہے جو اسے نڈھال کر رہا ہے اور یہ کہ اسلام پوجا پاٹ کا معاملہ نہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا نام ہے۔ یہ ایک سوشل آرڈر ہے۔ یہ سوشل آرڈر کی بجائے مذہب میں تبدیل اس وقت ہوا جب اس کی مرکزیت جاتی رہی۔ جب رسول ﷺ کا Successor کوئی باقی نہ رہا۔ جب امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے والا امت کا کوئی نمائندہ باقی نہ رہا جب Church and State دو جدا جدا Institutions بن گئے۔ یہ پھر سے سوشل آرڈر بن سکتا ہے۔ اگر مرکزیت لوٹ آئے۔ اگر رسول کے Succession کے سلسلہ کو پھر سے قائم کر دیا جائے۔ اگر پیشوائیت جو اپنی طبعی موت مر رہی ہے اسے دفن کرنے کا جلد انتظام کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی آئین بنانا کس قدر آسان ہو جاتا ہے اگر اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ Islamic Social Order درحقیقت Permanance اور Change کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ اگر اپنے موجودہ مسائل کی جزئیات کو قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر باہمی مشاورت سے طے کیا جائے۔ پھر بتایا کہ اسلامی طرزِ زندگی اور غربت وافلاس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں غربت وافلاس بے کسی اور بے بسی ہے وہاں اسلام

نہیں۔

حضرات! لاہور کے پبلک جلسوں میں آج سے چند سال پیشتر کھلم کھلا زمینداروں اور جاگیرداروں کی حمایت کی جاتی تھی۔ بڑے بڑے قارونوں کی حمایت میں ہامانؔ بڑی بے حیائی سے اپنا So-called اسلام پیش کرتے تھے اور مترفین اپنی انجمنوں کے نام بڑے دلکش، مثلاً شرعی زرعی اصلاحات وغیرہ وغیرہ رکھتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مترفین کا گروہ اسلام کا پیدا کردہ ہے۔ اور صرف اسی ایک وجہ سے ہمارا مغرب زدہ تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے متنفر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن جب پبلک جلسوں میں نظام ربوبیت پیش ہونے لگا تو باوجود اس کے کہ یہ نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی لوگوں نے کھڑے ہو کر کان لگانا شروع کیا کہ یہ نئی چیز کیا ہے۔ آہستہ آہستہ عوام کی طرف سے یہ مطالبات بھی ہونے شروع ہو گئے کہ وہ اس آواز کو بار بار سننے کے خواہشمند ہیں۔ اخبارات میں جب اِکے دُکے مضامین اس موضوع پر نکلنے شروع ہوئے تو لوگوں نے اس میں دلچسپی لی۔ گذشتہ دو ایک سالوں میں محترم پرویزؔ صاحب کے دورے جو ملک کے اس حصے میں ہوئے ان کا بھی نہایت خوشگوار اثر ہوا۔ آج ملک کے چوٹی کے اخبارات باوجود اس کے کہ یہ آواز ان کی پالیسی کے مطابق نہیں بادل ناخواستہ ہی سہی اس میں حصہ ضرور لیتے ہیں۔ آج ملک کا Intelligentsia کم از کم یہ کھڑا ہو کر سوچنے ضرور لگا ہے کہ یہ آواز کیا ہے۔ یا کم از کم ان کے جذبات میں اسلام کے خلاف وہ تندی موجود نہیں جو پہلے تھی۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہیں میں بڑی مدت سے جانتا ہوں وہ ایسے لوگ تھے جو اسلام کے نام سے بڑے بیزار تھے۔ لیکن اب وہ کم از کم اس مرحلہ سے نکل چکے ہیں جس میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسلامی ریاست کا تصور جنگلی بطخ کے شکار سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ تھوڑی بہت تبدیلی اس لئے ہے کہ قوم کے سامنے ایک واضح چیز پیش کی جا رہی ہے جس میں نہ الجھاؤ ہے اور نہ پریشان خیالی۔ لیکن حضرات! میں آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا کہ طلوع اسلام کا مشن بڑا کامیاب ہو چکا ہے۔ اس حد تک تو کامیاب ہے کہ ایک خوشبو ہے جو پھول سے باہر آ چکی ہے لیکن اس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے کام Single-handed نہیں ہو سکتے۔ ایک مفکر اپنی دھن میں لگا ہوتا ہے وہ افکار کی دنیا میں بستا ہے اور ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتا جاتا ہے۔ ان افکار میں اگر صلاحیت موجود ہو تو وہ اپنے اثرات خود بخود چھوڑ جاتے ہیں لیکن مفکر بذات خود اس سے بے نیاز ہوتا ہے کہ کون اس کی طرف توجہ دیتا ہے اور کون نہیں۔ جو لوگ ان افکار سے اتفاق رکھتے ہیں اور اس مفکر کے ہم سفر بننے کا ارادہ رکھتے ہیں یہ ان کا کام ہے کہ اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیں۔ اور اس کے پیغام کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ ان Ideals کو اپنانے کے بعد ان کا کام صرف یہی نہیں رہ جاتا کہ کتابیں پڑھتے رہیں۔ لیکچر سنتے رہیں اور خراج تحسین ادا کرتے رہیں۔ یہ بقول شخصے ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ جو لوگ محترم پرویز صاحب کے رفیق کار بننے کے متمنی ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ اس مشعل کو جو انہوں نے ان کے ہاتھ میں دی ہے لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل جائیں اور، اگر، اور جب ممکن ہو سکے ملک کے باہر بھی اس روشنی کو پھیلائیں۔ حضرات! اگر ارادہ مضبوط ہو اور آنکھیں

کھلی ہوں تو قدرتی طور پر ایسے مواقع ابھر ابھر کر سطح پر آتے رہتے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ پریس، پلیٹ فارم و دیگر ممکن ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے لیکن افسوس کہ طلوع اسلام کی بزموں نے ابھی تک اس بات کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا۔ آپ حضرات میں اکثریت ان احباب کی ہے جو اچھے پڑھے لکھے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اچھا لکھ سکتے ہیں۔ اچھا بول سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پریس میں اہمیت اس چیز کو حاصل ہوتی ہے جو حالات حاضرہ کے مطابق ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کوئی ایسا ملکی مسئلہ ہو جس پر قرآن کی روشنی میں تبصرہ کی ضرورت نہ ہو۔ ایک سنجیدہ تبصرہ کا ہر اخبار خیر مقدم کرتا ہے اور حکومت وقت بھی اس چیز کی خواہشمند ہے کہ تعمیری تبصرہ پبلک کی طرف سے پریس میں آئے۔ چنانچہ مواقع بے شمار ہیں، صرف ارادہ، ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ میں گذارش کر چکا ہوں کہ یہ کام Single-hand کرنے کا نہیں۔ اشد ضروری ہے کہ چند ذہین اور باہمت نوجوان اپنی زندگی اس کے لئے وقف کریں۔ ادارہ میں کچھ عرصہ زیر تربیت رہیں اور اس کے بعد ملک کے گوشوں میں پھیل جائیں۔ محنت مشقت اور جان و مال کی قربانی کے بغیر حضرات! کوئی کام پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

اور یہ بھی اشد ضروری ہے کہ شہروں کے علاوہ دیہات کی طرف توجہ دی جائے۔ اس کے لئے سستے اور عام فہم لٹریچر کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ آپ نے کسی ذاتی یا سیاسی مقصد کے لئے نہیں کرنا، بلکہ ایک دینی فریضہ ادا کرنا ہے۔

حضرات! میں گذارش کر چکا ہوں کہ طلوع اسلام کا قوم پر بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو Clear Thinking دی ہے۔ طلوع اسلام کی تعلیم کا، جو دراصل قرآن ہی کی تعلیم ہے ایک نمایاں اور مفید ترین پہلو یہ ہے کہ یہ فرقہ پرستی کے خلاف ہے اور اس نے ایسا فارمولا قوم کے سامنے رکھا ہے جس سے یہ بات دو اور دو چار کی طرح نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ قوم کے اندر وحدت پیدا کرنے کا طریق کیا ہے۔ میں اس وقت نظریات پر بحث نہیں کر رہا کیونکہ یہ چیزیں آپ حضرات کے سامنے تفصیل کے ساتھ آ چکی ہیں کہ قرآن فرقہ پرستی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ محترم پرویزؔ صاحب نے نہ صرف از روئے قرآن فرقہ پرستی کو شرک ثابت کیا ہے بلکہ فرقہ پرستی کی لعنت کو دور کرنے کے لئے طریق کار بھی متعین کیا ہے جب انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ پہلے فرقے ختم ہوں اور پھر اسلامی آئین بنے بلکہ پاکستان کے آئین میں یہ شق داخل کی جائے کہ فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس قبرستان میں دفن کیا جاتا ہے جس میں آج کل مرحوم سیاسی پارٹیاں مدفون ہیں۔ لیکن میرا مقصد اس وقت صرف یہ گذارش کرنا ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو صدیوں کے بعد مسلمان کے سامنے پھر سے بے نقاب ہو کر آئی ہے اور یہ وہ سچائی ہے کہ آج نہیں تو کل بالآخر امت مسلمہ کو اس پر آنا پڑے گا اور فرقہ پرستی اپنی طبعی موت مر کے رہے گی اور یہ وہ دن ہو گا جب قوم کا ہر فرد محترم پرویز صاحب کا شکر گزار ہو گا اور یہ دن قوم کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھے گا۔

حضرات! اس ضمن میں ایک گزارش آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو میرے خیال کے مطابق بڑی اہم ہے۔ اس برصغیر میں بہت سی سیاسی اور غیر سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ ان میں سے ایسی تحریکیں بھی تھیں جو بڑے نیک مقاصد لے کر اٹھیں۔

ابتداء میں ہر ایسی تحریک پوری قوم کی تحریک بن کے ابھری۔ فرقہ پرستی کے خلاف رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ سمٹ سمٹا کر خود ایک فرقہ بن کے رہ گئی اور اس شدت سے فرقہ بنی کہ اپنے اندر سوائے ان لوگوں کے جو پہلے سے موجود تھے کسی دوسرے کا وجود برداشت نہیں کرتی تھی۔ مجھے ان چیزوں کا ذاتی تجربہ ہے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ اس برصغیر میں جو مفکرین گزرے ہیں ان میں علامہ اقبال مرحومؒ نے بڑی عقلمندی سے کام لیا۔ اس لئے کہ وہ اپنے فکر کو عام کرتے گئے لیکن انہوں نے کوئی الگ جماعت نہیں بنائی۔ ایک تنظیم مقصود بالذات نہیں ہونی چاہئے بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہونا چاہئے۔ ہم خیال اصحاب کا کبھی کبھی مل بیٹھنا ضروری بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔ لیکن یہ اجتماعات صرف حصول مقصد کے لئے ہونے چاہئیں۔ گزشتہ چند مہینوں میں محترم پرویز صاحب کے ہاں ہر جمعہ کی شام کو ایک کلاس ہوتی تھی جس میں مختلف قرآنی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ چونکہ اس کلاس کا وقت تین بجے شام یعنی جمعہ کی نماز کے فوری بعد ہوتا تھا۔ اس لئے ایک صاحب نے تجویز پیش کی کہ جمعہ کی نماز شہر میں پڑھنے کی بجائے یہیں (یعنی پرویز صاحب کے مکان پر) پڑھ لیا کریں۔ پرویز صاحب نے فوراً جواب دیا کہ ہاں، مسجد قریب ہے یہاں آ کر پڑھ لیا کریں۔ بات بظاہر بڑی چھوٹی سی تھی اور آئی گئی ہوگئی لیکن دراصل ایک بہت بڑے راز کی حامل تھی۔ حضرات! اگر ہم نے جمعہ کی نماز کا اجتماع الگ شروع کر دیا تو سمجھئے کہ فرقہ بندی کی طرف پہلا قدم اٹھ گیا۔ چنانچہ یہ بڑی اہم بات ہے کہ تعلیمی اور مشاورتی امور کے علاوہ ہم ہر مسجد اور ہر سوسائٹی میں پھیل جائیں اور کوئی مسلمان چاہے اسے نظریات سے اختلاف ہی کیوں نہ ہو ہم سے دوری محسوس نہ کرے۔

حضرات! گزشتہ چند صدیوں میں سائنس نے ہر شعبہ میں بے انداز ترقی کی ہے۔ جہاں اس کے اکثر شعبے ایسے ہیں جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں وہاں چند شعبے ایسے بھی ہیں جن کی ترقی سے انسانیت کے لئے بڑے خطرات پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے بھروسے پر ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے پر تلی بیٹھی ہے۔ انسان آج ستاروں کی دنیا سے آگے جانے کی فکر میں ہے لیکن انسانیت کے مسائل ابھی جوں کے توں پڑے ہیں اور انسان کی عظیم سائنٹفیک جدوجہد کا ماحصل ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے ذہن انسانی آج بڑی کشمکش میں مبتلا ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو دو چیزیں ایسی نظر آئیں گی جن کا انسان کے درجۂ انسانیت کو بلند کرنے میں بڑا حصہ ہے۔ مذہب اور سائنس۔ جس وقت بھی دنیا پر تاریکی چھائی کوئی نہ کوئی نبی مشعل راہ لے کر نمودار ہوا۔ سوسائٹی کی اصلاح کی۔ جہالت کو دور کیا نسلی اور جغرافیائی حدود کو توڑا اور انسانیت کو کامیابی اور سربلندی کا راستہ دکھایا۔ لیکن آج کا مذہب جہاں انسانی ذہن پر زنگار کا کام دے رہا ہے وہاں سائنس سے بھی سوائے Perversion کے کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ انسان پھر اس حقیقت کو فراموش کر چکا ہے کہ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ مذہب آج کیوں بے اثر بن کر رہ گیا ہے۔ آج بیسویں صدی کے علم کے پیاسے اور طاقت کے بھوکے انسان کو کیوں مذہب سے رغبت نہیں رہی؟ اس لئے کہ مسلمان کی تراشیدہ ڈاڑھی۔ گرجے کی گھنٹی اور برہمن کی مالا میں ایک Scientific Mind کے لئے کوئی جاذبیت موجود نہیں۔ اس لئے آج کا سائنٹسٹ مذہب کو

ایک بے حقیقت شے سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اہل مذہب کے نزدیک سائنس ایک ایسی شے ہے جس نے انسان کو خدا سے دور کر دیا ہے۔ لیکن آج اہل مذہب کا اہل سائنس کے خلاف آواز اٹھانا چاند پر تھوکنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ایسی طاقت جس نے ارتقائے انسانی میں ایک بڑا اہم رول Play کیا ہو، اسے گھٹیا قرار دینا اور اس کی مخالفت کرنا سوائے حماقت کے اور کیا ہے بالخصوص جب مخالفت ایک ایسے فریق کی طرف سے ہو جس میں ایک مذہب دوسرے کے خلاف، ایک مذہب کا ہر فرقہ دوسرے کے خلاف اور ایک فرقے کے افراد کا انداز فکر الگ الگ ہو۔ دوسری طرف سائنس جس کے اصولوں کی حیثیت Universal ہو، جس میں ہر اصول کو ایک کسوٹی پر پرکھا جائے اور ساری سائنٹیفک دنیا اسے بیک وقت اپنائے، تو ایسی صورت میں اہل مذہب اہل سائنس کے آگے کیسے ٹھہر سکتے ہیں اس کا نتیجہ Intelligentsia کے اندر مذہب سے بیزاری ہے۔ گو اہل مذہب جہلاء کے اندر اب بھی اندھے کی لاٹھی گھمائے چلے جا رہے ہیں۔ حضرات ایسے دور میں جب کہ Science Vs Religion کا یہ عالم ہو اور ان دونوں کے اختلافات کو Exploit کرنے کے لئے Petty-minded politician اپنے پورے حربے استعمال کر رہا ہو۔ طلوع اسلام کا یہ کھول کھول کر بیان کرنا اور از روئے قرآن ثابت کرنا کہ اسلام مذہب نہیں ہے بلکہ ایک Social Order ہے اس سوشل آرڈر کی Structure کیا ہے۔ سائنس کا مقام اس سوشل آرڈر میں کیا ہے۔ سائنس کی تحقیقات کس طرح عین دین کے مطابق ہیں اور ان تحقیقات کو جب قرآن کی دی ہوئی مستقل اقدار کی روشنی میں Apply کیا جائے تو یہ کس طرح انسانیت کی تباہی کے بجائے انسانیت کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی ہیں۔ یہ طلوع اسلام کی تعلیم کا بڑا روشن پہلو ہے جس پر جس قدر بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ اے کاش ہمارے پاس اتنے وسائل موجود ہوں کہ ان نظریات کو دنیا کے سامنے اس انداز سے رکھ سکیں جس کے یہ مستحق ہیں۔

طلوع اسلام نے قرآن کے اکثر ایسے گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو اگر ساری امت کے سامنے بے نقاب ہو جائیں تو جس بھنور میں اس کی کشتی صدیوں سے پھنسی ہوئی ہے اس سے نکلنے کا فوری راستہ مل سکتا ہے۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے قرآن کی روشنی دکھا کر زمین پر ذاتی ملکیت کے تقدس کو ملیامیٹ کر دیا۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے اس حقیقت کو جو حرف قل العفو میں پوشیدہ تھی نمودار کیا۔ یہ طلوع اسلام ہی تھا جس نے Islamic Ideology کے خط و خال واضح طور پر قوم کے سامنے رکھے۔ درآنحالیکہ قوم کا کوئی بڑے سے بڑا تیس مارخاں پاکستان بننے کے بعد یہ نہ بتا سکا کہ آخر اس مملکت کے حصول کا مدعا کیا تھا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے نعرے کا مفہوم اگر کسی نے قوم کے سامنے رکھا تو طلوع اسلام اور صرف طلوع اسلام تھا۔ وحدت امت کا مفہوم اگر کسی نے قوم کو سمجھایا تو وہ طلوع اسلام تھا۔ یہ تخیل کہ فرد اپنی تمام صلاحیتوں کو نہ صرف اپنی پرورش بلکہ امت کی پرورش کے لئے صرف کرے۔ اگر فرد ایسا نہیں کرے گا تو نہ صرف اس کی اپنی بلکہ پوری ملت کی ارتقاء رک جائے گی۔ کس قدر حسین اور بلند تخیل ہے اور نوع انسانی کی مشکلات کا کتنا بڑا حل ہے۔ یہ نظریہ کہ بنیادی ضروریات زندگی کا پورا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عدل کا مفہوم ہر فرد کی نشوونما کے پورے مواقع بہم پہنچانا ہے اور

احسان کا مفہوم جہاں کسی فرد کی نشوونما میں کمی رہ جائے اس کو پورا کرنا ہے۔ انسان کی اجتماعی زندگی کا کتنا انقلاب انگیز پہلو ہے یہ کہ اسلامی مملکت میں مقصود بالذات مستقل اقدار کا تحفظ ہے اور یہ کہ Secular State کا مقصود ملک اور قوم کا تحفظ ہے چاہے اس مقصد کے حصول کے ذرائع کچھ بھی ہوں۔ یہ کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے اپنی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ کہ انسانی بچہ محض انسانی بچہ ہونے کی وجہ سے واجب التکریم ہے۔ یہ کہ ہر شخص کے مدارج اس کے ذاتی جوہر اور کام کی رو سے مقرر ہوتے ہیں۔ یہ کہ سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو قانون خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہو۔ یہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسرے سے اپنا حکم منوائے حکم صرف اللہ کا ہے۔ یہ کہ کتاب کی وارث ساری امت ہے چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساری امت کا فریضہ ہے۔ یہ کہ عملی انتظام کی سہولت کے لئے امت اپنے میں سے بہترین افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ؕ (49:3) کے سلسلے کو قائم رکھتی ہے۔ اور یہ کہ رسول ﷺ کی زندگی کے بعد فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ ؕ سے مراد ملت کی مرکزی Authority ہے جو رسول کا فریضہ یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر ادا کرتی ہے اور یہ کہ رسول کے بعد صرف مرکز ملت کو حق حاصل ہے کہ دینی امور میں فیصلہ دے اور یہ کہ پیشوائیت کی Institution کا دین کے ساتھ کوئی تعلق نہیں یہ دورِ ملوکیت کی پیداوار ہے۔ کتنے بڑے حقائق ہیں جن سے اگر قوم کو کسی نے آشنا کیا تو صرف طلوع اسلام نے کیا۔

دوسری طرف قرآن کا یہ گوشہ کہ وحی کا سلسلہ صرف انبیاء تک محدود ہے۔ اور یہ کہ عام انسانوں کا تعلق صرف خدا کے قانون کے ساتھ ہے، براہ راست خدا کے ساتھ نہیں۔ یہ ان تمام چور دروازوں کو بند کر دیتا ہے جن کے ذریعہ خود ساختہ نبی، اولیاء، پیر فقیر حشرات الارض کی طرح نمودار ہوتے ہیں اور ملت کے جسم کے ساتھ جونکوں کی طرح چمٹ کر اس کا خون چوس چوس کر نڈھال کرتے رہتے ہیں۔ طلوع اسلام کی آواز سب سے پہلی آواز ہے جس نے تاریخ کے ان بھیانک پردوں کو تار تار کیا جن کے اندر صدیوں سے اسلام چھپا تھا۔

حضرات! یہ بڑی اہم چیزیں ہیں۔ یہ قرآن کے گوشے بڑی مدت کے بعد بے نقاب ہو کر سامنے آئے ہیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم لوگ اس دور میں پیدا ہوئے جب قرآن کی روشنی پر سے بادل چھٹنے شروع ہو گئے ہیں۔ جب قرآن مسجد کے طاقوں اور غلافوں کے اندر سے نکل کر Intelligentsia کے Study-rooms میں پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔ اسے ملتِ اسلامیہ پر پھر سے بہار کا آغاز سمجھئے۔ لیکن پھول کھلنے تب شروع ہوں گے جب ہم سب مل کر ہمت اور استقلال کے ساتھ قدم آگے بڑھائیں گے۔ جب ہم اپنی حالت خود بدلنے پر آمادہ ہو جائیں گے تو رحمتِ ایزدی یقیناً ہمارے شاملِ حال ہوگی۔ والسلام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قائداعظمؒ کا خط گاندھی کے نام

حصولِ پاکستان کے بعد' قوم' مالِ غنیمت (نہیں بلکہ مالِ فے) کی تقسیم میں اس قدر جذب ہوگئی کہ اسے اپنے پرائے سب بھول گئے۔ (''مالِ فے'' اسے کہتے ہیں جو دشمن سے جنگ کئے بغیر ہاتھ آ جائے)۔ حتیٰ کہ یہ اقبالؒ کو بھی بھول گئی جس نے پاکستان کا تصور دیا تھا اور جناح کو بھی' جس نے اس تصور کی عملی تشکیل کی۔ اقبال کا نام کبھی کبھار ریڈیو پاکستان سے طبلہ کی تھاپ کے ساتھ سنائی دیتا ہے۔ باقی رہا جناح' سو اس کی یاد تازہ کرنے کا صرف یہ طریقہ رہ گیا ہے کہ جب کسی کو اپنے کسی مقصد کے لئے ضرورت پڑتی ہے تو وہ قائداعظم کا کوئی ایسا قول دہرا دیتا ہے جو اس کے مفید مطلب ہو۔ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک نہ اقبال کی ہر بات سند ہے۔ نہ قائداعظم کی۔ نہ کسی اور انسان کی۔ سندِ مطلق صرف خدا کی کتاب ہے۔ لیکن اپنے محسنوں کی ان خوبیوں کو یاد نہ کرنا جن کی بناء پر انہوں نے ہمارے لئے اتنا کچھ کیا تھا' اپنے ناخلف ہونے کا ثبوت دینا ہے۔

آج کی نشست میں ہم محترم قائداعظم کی ایک ایسی خصوصیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کا شہرہ دور دور تک تھا اور جس کی وجہ سے انہیں عصرِ حاضر کے سیاسی راہ نماؤں میں بلند مقام حاصل تھا۔ وہ خصوصیت تھی ان کی صاف گوئی۔ جرأت اور بے باکی۔ لگی لپٹی بغیر سیدھی سیدھی بات کہہ دینا۔

قائداعظم اگرچہ کوئی سکالر نہیں تھے لیکن انہیں انگریزی زبان پر جس قدر عبور تھا وہ ان کی تقاریر' بیانات' پیغامات اور خطابات سے ظاہر ہے۔ ان کی تقریر اور تحریر دونوں فی البدیہہ (Ex-Tempore) ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے صدارتی خطابات بھی۔ لیکن ان سب میں ان کا خاص انداز ہر جگہ نمایاں ہوتا تھا۔ یہ انداز ان کے خطوط میں اور بھی ابھر کر سامنے آ جاتا تھا۔ اور جب مخاطب مسٹر گاندھی ہوتے تو یہ چیز اپنی انتہا تک پہنچ جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ محترم قائداعظم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے گاندھوی طلسم کو اس طرح توڑا کہ ساری دنیا نے اسے بے نقاب دیکھ لیا۔ گاندھی جی جس اندازِ مہاتمائی سے اٹھے اور بڑھے تھے' اگر قائداعظم مرحوم کی عقابی نگاہیں اسے نہ بھانپتیں اور ان کا جرأت آموز اور صداقت آمیز تدبر اس کا راستہ نہ روکتا' تو اس وقت مسلمانوں کا جو حشر ہوتا اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ قوم کی آنے والی نسلوں کو اس نبرد آزمائی کی حقیقت سے باخبر رکھنے کے لئے' ہمارے نزدیک ضروری ہے کہ ''گاندھی۔ جناح'' کی پوری خط و کتابت' ضروری حواشی کے ساتھ' مستند طریق سے شائع کی جائے۔ یہ بڑا دلچسپ' سبق آموز اور دیدہ کشا مجموعہ ہوگا۔ ہم ذیل

میں اس مجموعہ میں سے صرف ایک خط نمونتہً پیش کرتے ہیں اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس خط و کتابت کا انداز کیا تھا اور محترم قائداعظم کا مقام کیا؟ یہ خط جنوری 1940ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت مسٹر گاندھی کی یہ پوزیشن تھی کہ ان کے ایک اشارے پر تیس کروڑ ہندو اور نیشنلسٹ مسلمان) انگریزوں جیسی طاقت کے مقابلہ میں آمادۂ بغاوت ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف قائداعظم اگرچہ مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن اس مسلم لیگ کی حالت' خود ان کے الفاظ میں اس سے زیادہ نہ تھی کہ۔

مسلم لیگ نام ہے تمہارے صدر اور اس کے ایک اٹاچی کیس کا۔!

اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ قائداعظم کا مدمقابل کون تھا اور ان کا ٹکراؤ کس بے پناہ قوت کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ اتنی بڑی بے پناہ قوت کے حامل ''مہاتما گاندھی'' کو قائداعظم کس انداز سے جواب دیا کرتے تھے۔ سوچئے کہ ایسا جواب دینے کے لئے کس قدر صداقت' جرأت اور بے باکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد رکھئے کہ قائداعظم وضع اور سلیقہ کے اس قدر پابند تھے کہ بدتمیزی یا ناشائستگی کا ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نہیں نکلا کرتا تھا۔ لہٰذا جس بات کو آپ درجِ ذیل خط میں دیکھیں گے وہ جرأت اور بیباکی ہے' بدتمیزی اور بدسلیقگی نہیں۔ اس کے ساتھ ہی شگفتگی اور تبسم زیر لبی بھی!

ہم اس خط کو اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ

(1) ہمارے ارباب حل وعقد جو 56 سالوں سے ہندو قیادت کے ساتھ مختلف فیہ معاملات پر گفت وشنید کر رہے ہیں' انہیں معلوم ہو جائے کہ ہندو کونسی زبان سمجھا کرتا ہے۔ اور

(2) آج جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ مذہب کا رشتہ نہایت کمزور رشتہ ہے اور قومیت کی تشکیل اشتراک وطن کی بنا پر ہوتی ہے نہ کہ وحدت مذہب کی بنا پر' انہیں (اگر خدا اور رسول کے ارشادات سے کچھ دلچسپی نہیں تو کم از کم وہ) یہی دیکھ لیں کہ قائداعظم کا اس باب میں کیا خیال تھا اور ان کے نزدیک انسانی زندگی میں مذہب کی صحیح پوزیشن کیا تھی۔ (ان باتوں کا حقیقی لطف تو خط کی اصل زبان' انگریزی ہی سے مل سکتا ہے۔ بایں ہمہ' ہم کوشش کریں گے کہ اس کے آزاد ترجمہ میں اس کا کچھ نہ کچھ انداز آ جائے) خط یہ ہے۔

ڈیئر مسٹر گاندھی:

مجھے آپ کا خط ملا اور اس مضمون کی نقل بھی جسے آپ نے ہریجن میں بغرض اشاعت بھیجا ہے۔ میں نہ صرف آپ کے اس حسنِ اخلاق کے لئے سپاس گذار ہوں بلکہ اس تشویش کے لئے بھی جو آپ کو میرے اس مقصد کے آگے بڑھانے کے سلسلہ میں لاحق ہو رہی ہے' جسے آپ میرے پیغامات اور تگ وتاز میں محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے وہ تمام مفروضے غلط ہیں (جن پر آپ اپنی منطق کی عمارت استوار کر رہے ہیں)۔ آپ آغازِ سخن ''ہندوستانی قوم'' (انڈین نیشن) کے نظریہ سے کرتے ہیں جس کا کہیں وجود ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ کی منطق کی خشتِ اول ہی ٹیڑھی ہے تو اس پر اٹھائی ہوئی دیوار کس طرح سیدھی ہو سکتی ہے؟ لہٰذا اس غلط مفروضہ سے آپ جن نتائج تک پہنچیں گے وہ سب غلط ہوں گے۔ مجھے اتنا خیال ضروری تھا کہ کم از کم آپ اخبارات کی یک طرفہ رپورٹوں اور ان کی افسانہ تراشیوں اور

افترا پردازیوں سے بہک نہیں جائیں گے۔ لیکن آپ کے مضمون کا بیشتر حصہ بھی محض آپ کے تخیل کی خلاقی ہے۔ حقیقت پر مبنی نہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ آپ سیوا گاؤں کے بھورے میں تخلیہ کی زندگی بسر کرتے ہیں (اس لئے آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے) اور دوسری وجہ یہ کہ آپ کے تمام خیالات اور حرکات آپ کی ''اندرونی آواز'' کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ آپ کو حقائق سے کچھ واسطہ ہی نہیں۔ یا یوں کہئے کہ اس چیز سے کچھ واسطہ نہیں جسے ایک عام فانی انسان ''عملی سیاسیات'' سے تعبیر کرتا ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی اس پر تعجب ہوتا ہے کہ بال آخر آپ میں اور عملی سیاسیات میں کونسی بات مشترک ہے یا جمہوریت میں اور ایک ایسی سیاسی جماعت کے ڈکٹیٹر میں، جس کا وہ ''چار آنہ'' کا ممبر بھی نہیں؟ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ آپ کے نزدیک کانگریس اس قابل ہی نہیں کہ آپ اس کے ممبر بنیں۔ (آپ اسے اپنی کسر شان سمجھتے ہیں!)۔

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ ''یوم نجات'' پر میرے ہدیۂ تہنیت نے آپ کو طلسم پیچ و تاب نہیں بنا دیا'' قائداعظم جناح زندہ باد'' کی خاموش دعا میں آپ کی شرکت، آپ کی شرافت کی دلیل ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں، لیکن بایں ہمہ، مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ آپ نے ''یوم نجات'' کے حقیقی مفہوم اور اس کی اہمیت کو محسوس کر لیا ہے۔[1]

یہ خبر درست ہے کہ بہت سے غیر کانگریسی ہندوؤں نے ہمارے مطالبہ کی صداقت اور ہمارے دعوے کے مبنی بر انصاف ہونے کی بناء پر ''یوم نجات'' پر ہم سے اظہار ہمدردی کیا ہے۔ نیز جسٹس پارٹی کے لیڈروں، اچھوت اقوام اور پارسیوں نے بھی، جنہوں نے کانگریسی راج کے ہاتھوں مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپ نے ان کے اس اظہار ہمدردی کو جو معنی پہنائے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس کے صحیح مفہوم کو سمجھے ہی نہیں۔ ان کا یہ عمل اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ مشترکہ مصیبتیں کس طرح اجنبیوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب لے آتی ہیں اور اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ باہمی مفاد کا اشتراک مسلمانوں اور اقلیتوں میں کس طرح اتحاد پیدا کر سکتا ہے۔ میں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتا ہوں اور اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکہ ہے نہ شک و شبہ۔ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ایک ملک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن (آپ کو یاد ہوگا کہ) جب آپ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ قوتِ محرکہ کونسی ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے۔ سیاست ہے۔ یا عمرانی (سوشل) اصلاح ہے۔۔۔ تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔ ایک مرتبہ میں ایک ایسے وفد کے ساتھ مسٹر مانٹیگو کے پاس گیا جو خالصتہً سیاسی تھا۔ مانٹیگو نے مجھ سے کہا کہ تم ایک سوشل ریفارمر ہو۔ تم اس سیاسی جمگھٹے میں کیسے شریک ہو گئے؟ میں نے جواب میں کہا کہ یہ بھی میرے سوشل کاموں کا ایک توسیعی گوشہ ہے۔ اگر میں تمام نوع انسانی کے دکھ درد میں

---

[1] جب ہندوستان میں کانگریس نے وزارتوں سے استعفیٰ دیا تو سارے ملک میں مسلمانوں نے ''یوم نجات'' منایا کہ اللہ نے انہیں تنگ نظر ہندو کی محکومیت سے نجات دلائی ہے۔ اس پر سارا ہندو پریس اور ہندو جاتی سٹپٹا اٹھی تھی۔

شریک نہیں ہوسکتا۔ اگر میں اپنے آپ کو ان میں کا ایک محسوس نہیں کرتا۔ تو میری زندگی قطعاً مذہبی زندگی نہیں ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن ہے جب تک میں سیاسیات میں حصہ نہ لوں (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و عمل کا دائرہ ایک قابل تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوع انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں، میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب، انسان کے ہر عمل کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں، محض غوغا آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے۔ جن میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں۔

آج اس ملک میں آپ سے بہتر اور کوئی شخص ایسا نہیں جسے ہندوؤں کا اس قدر اعتماد حاصل ہو اور جو ان کے نمائندہ کی حیثیت سے، معاملات کا آخری فیصلہ کر سکے۔ ان حالات میں اگر آپ سے یہ توقع کی جائے کہ آپ سراب کے پیچھے لپکنے کے بجائے (دنیائے حقیقت کی طرف آئیں اور) جس کام کے آپ اہل ہیں اسے سرانجام دیں، تو میرا خیال ہے کہ یہ توقع کچھ زیادہ اور یہ امید موہوم نہیں قرار دی جانی چاہئے۔۔۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور واقعات برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آپ کی مناظرہ بازی۔ یا ہر ہفتہ ہریجن (اخبار) میں مابعد الطبیعیات، فلسفہ اور اخلاقیات پر اپدیش۔ یا چرخہ، کھدر اور اہمسا کے متعلق آپ کے انوکھے نظریات، ہندوستان کو آزادی نہیں دلا سکتے۔ عمل اور صحیح سیاسی تدبر ہی ہمارا قدم ہماری منزل مقصود کی طرف بڑھا سکتا ہے۔ میں نے یہ کچھ اس خیال سے کہا ہے کہ آپ شاید (حقائق کو سامنے رکھ کر) اپنی پوری توانائی اور استعداد کے ساتھ ملک کی بہبود کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور قدرت نے جو صلاحیتیں آپ کو دی ہیں انہیں اہلِ ملک کی مرفہ الحالی کے لئے صرف کریں۔

آپ کو اس سوال نے بڑا پریشان کر رکھا ہے کہ میرے نام کے ساتھ القاب کون سے استعمال کئے جائیں۔ آپ کی اس تشویش کا شکریہ، لیکن میں نہیں سمجھتا کہ القاب میں بال آخر رکھا کیا ہے؟ پھول کو کسی نام سے پکاریئے اس کی خوشبو میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ لہٰذا یہ معاملہ میں آپ پر ہی چھوڑتا ہوں۔ مجھے اس سے چنداں دلچسپی نہیں۔ اس پر البتہ تعجب ضرور ہے کہ آپ اس غم میں کیوں گھلے جا رہے ہیں؟ (برا نہ منایئے تو ایک بات عرض کروں!) آپ نے لکھا ہے کہ آپ موجودہ القاب ان آداب معاشرہ کے مطابق استعمال کر رہے ہیں جو آپ نے حکیم صاحب مرحوم سے سیکھے تھے۔ لیکن حیرت ہے کہ خود حکیم صاحب کی زندگی میں، اور ان کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک بھی، آپ مجھے (حکیم صاحب کے سکھائے ہوئے القاب سے نہیں بلکہ) محض ''مسٹر'' کہہ کر پکارتے رہے۔ پھر مجھے ''شری'' کے لقب سے بھی یاد فرماتے رہے اور ان دونوں کے درمیان ''دوست'' کہہ کر بھی! لیکن چھوڑیئے ان باتوں کو۔ القاب میں بال آخر کیا رکھا ہے۔؟

(آپ کا مخلص: ایم۔ اے۔ جناح)

ڈاکٹر طاہرہ اکرم، گجرات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

(یہ تقریر 27 اکتوبر 2019ء بروز اتوار ادارہ طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن کے موقعہ پر کی گئی)

السلام علیکم!

خواتین وحضرات میں آپ میں سے ہر ایک کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ تشریف لائے۔

آج کل پاکستان میں تحریکِ انصاف اور عمران خان صاحب کی حکومت ہے اور وہ تبدیلی کا نعرہ لے کر آئے اور اُس کے داعی بھی ہیں لیکن صبح سے شام تک میڈیا پر عام طور پر یہ سننے کو ملتا ہے کہ ہمارے سیاستدان کرپٹ ہیں۔ ہمارے بیوروکریٹ کرپٹ ہیں یہ محکمہ نااہل ہے۔ وہ محکمہ کے لوگ چور ہیں اور ہم بظاہر یہ سب سُن کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ یہ ہماری بات نہیں ہو رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت اور تمام محکموں کے لوگ اور ملازمین ہمارے بھائی اور بہنیں ہیں۔ وہ ہم میں سے اُٹھ کر اُن عہدوں پر لگے ہیں۔ وہ سارے ہمارے نمائندے ہیں وہ ہمارے گھروں اور معاشروں کا حصہ ہیں۔

ہم میں سے ہر انسان چاہے وہ عوام ہو، حکومت ہو یا کسی محکمہ میں وہ اسی طرح عمل کرے گا جو اس نے اپنے ماں باپ، لوگوں سے اور ماحول سے پایا ہے۔

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے مسلمان قرآن کے پیروکار ہونے کے باوجود اپنے گھروں میں اور معاشرہ میں نہ صرف جھوٹ، دھوکہ دہی، بدکرداری کا صرف شکار نہیں بلکہ اُسے ایک کارنامہ سمجھتے ہیں۔

ہم زندگی کو صرف ابھی اور یہیں کی زندگی سمجھتے ہوئے بالکل غور وفکر کیے بغیر نہ صرف غلط عملی کا شکار بلکہ دوسروں کی غلط عملی کا بھی موجب بن رہے ہیں۔ یہ بدنظمی، بدعملی، چور بازاری کب اور کہاں شروع ہوتی رہی ہے بحث نہیں ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم کس طرح اپنے اردگرد کی خوف وحزن، غم، دھوکہ دہی اور چور بازاری کی دنیا سے نکل کر عزت وآبرو اور امن کی فضا میں جاسکیں تو قرآن کے اصولوں کے مطابق توبہ، استغفار یعنی پہلے یہ احساس کرنا کہ یہ بات اور یہ راستہ غلط ہے پھر صحیح راستے کی طرف واپس آنا۔ اور اپنی صحیح منزل کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ہم اس دنیا میں آئے اور جب ہم اس دنیا سے جائیں گے تو ہم نے اس دنیا میں بہتری پیدا کی اور اپنے حصے کی بہتری چھوڑی۔

اللہ کی ذات اپنے علم اور غیر متبدل قوانین کے ذریعے پہچانا جاتا ہے قوانین جو قرآن میں دے دیئے گئے ہیں۔ اللہ کے یہ قانون انسانی ذات دنیا اور پوری کائنات پر محیط ہیں۔

سورۃ یونس میں ہے:

''یاد رکھو تم جو راستہ چاہو اختیار کرلو۔ تمہارا ہر قدم اسی کے قانون کی طرف اٹھے گا۔ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ اسی کے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہوگا۔ تم اس کے احاطہ سے باہر نہیں جاسکتے۔''

یہ قانون ایسے محکم اور غیر متبدل ہیں کہ انسان چاہے بھی تو انہیں تبدیل نہیں کرسکتا۔ مثلاً یہ اصول ہے کہ چینی میٹھی ہوگی۔ نمک نمکین ہوگا۔ اور جب بھی جہاں بھی آگ میں ہاتھ ڈالو گے۔ آگ جلا دے گی۔ اس طرح یہ ایک غیر متبدل اصول ہے کہ جھوٹ، چوری، دھوکہ دہی اور عیاری کی سزا ملے گی۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی لیکن چونکہ جھوٹ بولنے کا نتیجہ اسی وقت سامنے نہیں آتا لہٰذا انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ کوئی سزا نہیں ملنے والی کیونکہ وقتی طور پر وہ نہ صرف بچ گیا بلکہ اُسے کوئی فائدہ بھی ہوگیا ہوگا۔ لیکن اللہ کے غیر متبدل اصول کے مطابق اس عمل کی سزا اُسی وقت مرتب ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ یعنی آپ کی ذات پر منفی عمل شروع ہوجاتا ہے کہ آپ کی Body Language ایک جھوٹے، مکار انسان کی ہے سچے اور اچھے انسان کی نہیں ہے۔

ہم اگر یہ بات بھی مانتے ہیں کہ ان سب برائیوں کا علاج تعلیم ہے تو پڑھ لکھ جائیں تو اچھے انسان بن جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں پڑھا لکھا انسان بہتر انسان ہے بہ نسبت اَن پڑھ کے لیکن عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ معاشرے میں پڑھا لکھا انسان بہتر طریقے سے جھوٹ بول رہا ہے بہتر طریقے سے چوری کررہا ہے اور دوسروں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ پچھلے 10 سال کا دور حکومت اس کی زندہ مثال ہے آخر وہ کیا اعمال ہیں کہ جن سے ہم پہلے انسان اور پھر مسلمان کے درجہ تک پہنچ جائیں کہ جب ہم اس دنیا کو چھوڑیں تو ہم نے بہتری میں اضافہ کیا ہو۔ جہاں تک میں قرآن اور باباجی کی تعلیم کو سمجھ سکی ہوں وہ ہے تعلیم، تربیت و کردار۔

تعلیم سکول، کالج جانا، علم کو حاصل کرنا ڈگری لینا لیکن تربیت و کردارِ انسانی وہ عمل ہے جو کہ انسان کو حیوان سے بدتر درجے سے اُٹھا کر انسانی سطح اور مسلمان کی سطح پر لے کر آتی ہے کہ یہ اپنے آپ میں اور پھر دوسروں کی بہتری کا سبب بنتے ہیں۔

اب میں خاص طور پر اپنی بہنوں اور بیٹیوں اور آپ کی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں سے مخاطب ہوں۔ تربیت کی سب سے پہلی اور اہم سیڑھی ماں کی گود ہے لیکن ہمارے معاشرے نے اس پہلی سیڑھی اور درس گاہ کو اس قدر کمزور، بدحال، پسماندہ اور جاہل کردیا ہے یہ بغیر سوچے سمجھے کہ اس کا اثر کتنا خطرناک حد تک جائے گا اور جارہا ہے اور

جاتا چلا جائے گا۔ اور ڈگریوں کے باوجود، جاہلیت، پسماندگی، ابتری۔ گھروں کے اندر خوف، بدچلنی کی فضا بڑھتی جائے گی۔ اُس کا واحد حل یہ ہے کہ ہمیں آج اور ابھی سے اس بات کا احساس کرنا ہے کہ اصل میں کرنے کا کام کیا ہے۔

اس پوری دنیا میں بہتری لانے کے لئے سب سے پہلے یہ بہتری آپ کی ذات سے شروع ہوتی ہے آپ کی اپنی ذات میں بہتری آئے گی تو آپ کا گھر، محکمہ، معاشرہ، شہر، ملک اور دنیا بہتر ہوگی۔

پہلے میری بہنو اور بیٹیو اور میرے بھائیو اور بیٹو آج اور ابھی سے یہ عہد کریں کہ ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق سوائے اللہ کے قانون کے کسی سے خوف نہ کھائیں خوف اور ڈر سے جھوٹ نہ بولیں اللہ سے صدقِ دل سے دعا کریں کہ اللہ ہم کو خوف اور ڈر سے نجات دے۔ میری مدد کر ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ'' جب آپ خود ایسا کریں گے آپ کے بچے بھی ایسا کریں گے۔ نمونہ بن کر دکھائیں گھر والوں کو اور پھر معاشرے کو، یہ وہ اصل تبدیلی ہے جو آپ کی اپنی ذات سے شروع ہوتی ہے۔ یقین رکھیں کہ معاشرہ کتنا ہی عذاب ناک کیوں نہ ہو۔ آپ کا یہ راستہ آپ اور دوسروں کے لئے صحیح معنوں میں چراغِ راہ اور سکون کا باعث بنے گا۔

یہ بات ہائی سکول اور کالج کی لڑکیوں اور لڑکوں سے کہیے کہ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ اسے صحیح اور غلط گزارنا ہماری Choice ہے۔ اگر آپ صحیح راستے پر صحیح معنوں میں چلیں گے اللہ کا قانون جو ساری کائنات کو ملا ہے آپ کا ساتھ دے گا۔ اور آپ کی اس دنیا میں اور یہاں سے جانے کے بعد آپ کی عزت ہوگی۔ لوگ آپ کو ایک ایماندار اور باکردار انسان کے طور پر جانیں گے۔ یہ صرف اور صرف آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے کہ آپ ''موسیٰؑ'' کا راستہ اختیار کریں یا فرعون کا اور رہتی دنیا تک ''صالحین'' کے طور پر جانے جائیں یا عبرت کا نشان۔

آپ کی ذات کی تبدیلی ہی وہ تبدیلی ہے جو اس معاشرے اس حکومت اور ملک کو بہتر کرے گی۔

تری دُعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری
مِری دُعا ہے تِری آرزو بدل جائے

سانحہ ارتحال

بزمِ طلوعِ اسلام کراچی (ملیر سٹی) کے نمائندہ محترم آصف جلیل صاحب کی اہلیہ طویل علالت کے بعد وفات پا گئی ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور آصف جلیل صاحب اور ان کے بچوں اور دیگر پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ طلوعِ اسلام ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

سالانہ کنونشن ادارہ طلوعِ اسلام

سماعت گاہ کے مناظر

منعقدہ مورخہ 26 اکتوبر 2019ء










سالانہ کنونشن ادارہ طلوعِ اسلام
(سیمینار)

منعقدہ مورخہ 27 اکتوبر 2019ء



محمد عمر نظامت کے فرائض ادا کرتے ہوئے



محمد اکرم راٹھور اقبال کی نظم پڑھتے اور خطبۂ افتتاحیہ دیتے ہوئے



ارشد اقبال (نعتیہ نثر از پرویزؒ) پیش کرتے ہوئے



خورشید انور وائس چیئرمین ادارہ اظہار خیال کرتے ہوئے



خالد بشیر فاروقی اپنا مضمون پیش کرتے ہوئے



اطہر محمود نظم سناتے ہوئے



سامعینِ کرام



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



سماعت گاہ کا ایک منظر



اسٹیج پر موجود مہمانانِ خصوصی (دائیں سے بائیں) ڈاکٹر طاہرہ اکرم، ڈاکٹر اعجاز رسول، خورشید انور، ڈاکٹر حامد اے میاں، ڈاکٹر انعام الحق، محمد اکرم راٹھور، محمد عمر



سماعت گاہ کا ایک منظر



ممتاز خان اظہارِ خیال کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر





سماعت گاہ کا ایک منظر



ڈاکٹر اعجاز رسول تقریر کرتے ہوئے



ڈاکٹر فریدالدین اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے



ڈاکٹر شاہ ریاض تقریر کے دوران



محمد شکیل مغل اظہارِ خیال کے دوران



پروفیسر ڈاکٹر صالحہ غنی مضمون پڑھتے ہوئے



ڈاکٹر طارق محمود اظہارِ خیال کے دوران



عقیل حیدر اظہارِ خیال کرتے ہوئے



ڈاکٹر طاہرہ اکرم اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے



ڈاکٹر حامد میاں وائس چیئرمین ادارہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے



حاضرینِ مجلس کا ایک منظر



سامعینِ کرام



صدرِ مجلس، ڈاکٹر انعام الحق صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے

خالد بشیر فاروقی، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حج کو ایک متحرک ادارہ کیسے بنایا جائے

(یہ تقریر 27 اکتوبر 2019ء بروز اتوار ادارہ طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن کے موقعہ پر کی گئی)

اگر آپ آج ایک فیصلہ کریں کہ ہم نے دین کافر کو اپنانا ہے تو آپ بڑی ترقی کر جائیں گے اور اگر مُلّا کے دین کو اپنانا ہے تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے مجھ سے پہلے یہ بات اور کسی نے بھی کہی ہے۔ ہاں وہ تو ہمارے علامہ اقبال علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

دین کافر فکر وتدبیر جہاد دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

چلیں آج ہم بھی فکر وتدبیر کرتے ہیں:

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے وہ کیا گردُوں تھا تُو جس کا ہے اک ٹُوٹا ہوا تارا

وہ یہ کہ آج میری جتنی بھی عمر ہے میں نے بقیہ زندگی میں کیسا راستہ اپنانا ہے، میں نے وہ کون سے کام کرنے ہیں کہ جب میں اس زندگی کی لائن کو عبور کر کے دوسری زندگی میں داخل ہو جاؤں تو اللہ یا اُس کے نمائندے میرا بھرپور استقبال کریں۔

اگر ہم اپنا محاسبہ کریں انفرادی طور پر یا من حیث القوم تو سمجھ آئے گا کہ جہالت ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جہالت ختم ہو جائے اور شعور جاگ جائے تو حسنات کا پلڑا بھاری ہونا شروع ہو جائے گا اور بڑے بڑے مسائل بھی حل ہو جائیں گے۔ بڑے مسائل یعنی غلامی، محکومی، غربت، بھوک افلاس۔

میرا ہوم ورک بتاتا ہے کہ غلامی محکومی یا بھوک جیسے مسئلے سب سے بڑے مسئلے ہیں لیکن ان کا حل کیا ہے۔ غربت کی تصویر کشی میں نے کچھ اس طرح کی ہے کہ:

(1) ایک شخص روٹی روزی کی تلاش سے تھک کر جنگل کا رخ کرتا ہے جنگل میں بھی مارا مارا پھرتا ہے مگر بے سود۔ دوبارہ شہر کا رخ کرتا ہے اور سوچتا ہے کوئی ہنر ہی لیتا جاؤں۔ ایک درخت کے پاس کوئی دس فٹ گہرا گڑھا کھود کر اور رسیوں سے جال بُن کر گھاس پھوس لگا دیتا ہے اور رات کو درخت کے ساتھ ایک بکری کا بچہ باندھ کر سو جاتا ہے۔ رات کو ایک نوجوان ببر شیر بچے کی آواز سن کر اسے پکڑنے کے لئے پاس آتا ہے اور گڑھے میں گر جاتا ہے ___ یہ بندہ کوئی آٹھ دن تک اسے تازہ گوشت کھلاتا ہے اور دوست بنا لیتا ہے۔ ایک دن اُسے شہر لیجا کر کرتب سیکھاتا ہے۔ اسے کہتا ہے اس رِنگ سے جمپ لگاؤ۔ جنگل کا بادشاہ ببر

شیر دھاڑتا ہے کہ میں تو بادشاہ ہوں۔ مگر جمپ لگاتا ہے کہ مالک سے کھانا ملے گا۔ غور کیجئے جنگل کا بادشاہ بھوک کی خاطر بندر بن کرناچتا ہے۔

(2) دو فقیر ایک مسجد کے پاس بھیک مانگتے ہیں۔ انہیں روز جھاڑیں سننے کو ملتی ہیں کبھی لوگوں سے کبھی مولوی صاحب سے اور پولیس سے۔ ایک دن ایک فقیر کی کروڑوں روپے کی لاٹری نکل آئی تو دوسرا اس سے پوچھتا ہے تم ان پیسوں کا کیا کرو گے ___ اب غریب قوم کی سوچ ملاحظہ کریں۔ فقیر کہتا ہے میں یہیں اُس بڑے پلاٹ پر عالیشان مسجد بناؤں گا اور اس کے داخلی دروازے پر خود دو مانگا کروں گا مجھے وہاں سے کوئی نہیں ہٹائے گا۔

(3) سر ونسٹن چرچل: برطانیہ کا وزیر اعظم 1940-1945ء دوسری جنگِ عظیم۔ قوم سے خطاب کے لئے ریڈیو سٹیشن تقریر کرنے جاتا ہے۔ ایک ٹیکسی رو کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ڈرائیور سے کہا مجھے ریڈیو سٹیشن لے چلو۔ ڈرائیور نے کہا مجھے تو گھر جانا ہے آج چرچل کی تقریر سننی ہے۔ چرچل خوش ہوتا ہے اور 10 پاؤنڈ اس کے آگے رکھتا ہے۔ ڈرائیور خوش ہو کے جواب دیتا ہے۔ دفع کرو چرچل کو میں آپ کو ریڈیو سٹیشن چھوڑتا ہوں۔

ان واقعات کا ملخص یہ ہے کہ اگر ریاست نوجوانوں کے رزق کا بندوبست کر دے تو وہ تفکر کرنا شروع کر دیں گے۔ انہی کے ہاتھوں نئی نئی ایجادات بھی ہونگی۔ میرے تدبر و تفکر کا اگلا مرحلہ آتا ہے۔ جس کے لئے میں صفحہ پلٹ رہا ہوں اور ایک زبردست تجویز دے رہا ہوں۔ اے کاش کہ یہ تجویز حاکم وقت تک پہنچ جائے تجویز ہے کہ ''حج ایک متحرک ادارہ کیسے بن سکتا ہے؟''

عالمِ اسلام کے اتحاد کا مقصد ایک عرصہ سے مسلمانوں میں مقبول چلا آرہا ہے۔ اگر اسے ٹھیک ٹھیک عملی جامہ پہنایا جائے تو اس سے اسلامی ممالک میں ایک ایسا انقلاب برپا ہو سکتا ہے جس کی سابقہ ایک ہزار سال میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

بلاشبہ حج کا ادارہ ابتداء ہی سے ایک عظیم مقصد کے لئے تشکیل پذیر ہوا تھا۔ اس موقع پر تمام دنیا کے مسلمان مکہ مکرمہ میں اکھٹے ہوتے ہیں۔ صرف سلیکٹڈ لوگ جانے چاہئیں جہاں وہ ایک عقیدت اور برادرانہ جذبوں کے ساتھ ایک اجتماعی عبادت میں شریک ہوتے ہیں۔ نہ صرف ربِ کریم سے اپنی بہبود کی دعا کرتے ہیں بلکہ پوری ملت اسلام کے اتحاد و غلبہ اور ترقی کے لئے بھی دعا مانگتے ہیں۔ حالانکہ نوجوان طبقہ سے بیشمار دفعہ سننے میں آیا ہے کہ ہماری دعائیں قبول کیوں نہیں ہوتیں۔ پھر انہیں یہ بتانے والا بھی کوئی نہیں کہ زندگی میں کامیابی، محنت اور اس کے صلے کے کلیہ پر ہے۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہے کہ جس مشکل کے سدباب کے لئے گڑگڑا کر دعا مانگی جارہی ہے اس مشکل کو دور کرنے کے لئے کیا کچھ عمل بھی کیا ہے؟

اس مضمون کے عنوان حج کو ایک متحرک ادارہ کیسے بنایا جائے کو قابل عمل بنانے کے لئے کیا کرنا چاہے ملاحظہ کیجئے۔ ہزاروں لاکھوں زائرین کے اس اجتماع میں کئی مشہور لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اپنے ملک میں صاحبِ اقتدار یا نمایاں حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اُن میں معاشرے کے ہر طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً انجینئر، صنعتکار، معیشت دان، بینکار، قانون دان، ماہرین زراعت و تعلیم، ڈاکٹرز، سائنسدان، سرکاری عہدہ دار، علماء دین، ماہرین ابلاغیات۔ اگر ان سب

زائرین کو اکٹھے مل بیٹھنے اور باہمی دلچسپی کے امور پر غور وفکر کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو اس کے نتیجے میں نا صرف عالمِ اسلام کی سربراہ شخصیات کے مابین مفید روابط استوار ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کے اُن مسائل کے بارے میں بھی آگاہی ہوگی جن سے آج مسلم ممالک عموماً دوچار ہیں۔ کرنا یہ ہوگا کہ مکہ میں ہر شعبۂ ہائے زندگی کے الگ الگ سیکرٹریٹ بنانے ہونگے ہر دفتر کی اپنی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ مثلاً زراعت کو لے لیجئے۔ سب ممالک کے ماہرینِ زراعت اپنے سیکریٹریٹ میں صبح سے دوپہر ظہر کے وقت تک اپنا اجلاس بلائیں گے اور اپنے اپنے ملک میں زراعت کے متعلق تازہ تحقیق پر بات کریں گے اور مشکلات بھی سامنے لائیں گے اور ایک لسٹ بنا کر اپنے اپنے ملک لے جا کر غور وخوض کریں گے مثلاً اگر مصر میں گندم فی ایکڑ پیداوار 40 من اور پاکستان میں 60 من ہے تو پاکستانی ماہر مصر جا کے اُن کی پوری پوری مدد کریں گے تا کہ وہاں بھی پیداوار بڑھ سکے۔

ظہر اور عصر کے درمیان Assistant Level کے آفیسر منٹس لکھیں گے اور اگلے روز کا ایجنڈا تیار کریں گے۔

مکہ میں ایک بڑے آڈیٹوریم کی ضرورت ہوگی۔ یہاں کئی کمیٹی روم ہوں گے جن میں عمومی شعبہ جاتی اجلاس منعقد ہوں گے۔ ان اجلاسوں کی کاروائی پر 6 زبانوں عربی، انگریزی، انڈونیشی، فرانسیسی، اردو اور فارسی میں ایک چینل ٹرانسلیشن سسٹم کے ذریعے عمل درآمد کیا جائے گا اس میں ریفرنس اور ریسرچ لائبریریوں کے علاوہ پریس ریڈیو اور T.V کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔

حجاج کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے اپنے ملک جا کر سرکاری مشینری کے ذریعے ان تجاویز پر عمل درآمد کو یقینی بنائیں۔ اس طرح وہ ملک خود کفیل ہو جائے گا۔

سیکرٹریٹ میں جن امور پر غور فکر ہوگا۔ وہ مندرجہ ذیل ہو سکتے ہیں۔

1۔ عالمگیر ربوبیت فلاحِ انسانیت کے پروگرام
2۔ اسلامی دنیا کا دفاع[1]
3۔ باہمی روابط اور اس کا طریقہ کار
4۔ مسلم ممالک میں غذائی قلت کا مسئلہ
5۔ صحت کا شعبہ
6۔ معیشت کی بہتری
7۔ تعلیم کا فروغ
8۔ انفراسٹرکچر کی ترقی

اس طرح مسلم دنیا کے بہترین دماغ ہر سال یکجا ہوں گے۔ ان میں قابلِ قدر روابط استوار ہوں گے اور یوں ملتِ اسلامیہ کے بہترین منصوبے بروے کار لائے جا سکیں گے۔ اور آخر میں:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(1) یہاں ایک بات نوٹ کیجئے غیر مسلموں نے UN، سکیورٹی کونسل تشکیل دی اور اپنا دفاع مضبوط کرنے کے لئے NATO بنائی اس طرح "عمل" تو اُنہوں نے کیا۔

خورشید انور، سوات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آیئے دیکھتے ہیں آئینہ قرآنی میں

(یہ تقریر 27 اکتوبر 2019ء بروز اتوار ادارہ طلوعِ اسلام کے سالانہ کنونشن کے موقعہ پر کی گئی)

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَجٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾ (49:15)

مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر (علی وجہ بصیرت) ایمان لائیں۔ اس طرح کا ایمان کہ اس کے بعد ان کے دل میں ذرا سا بھی اضطراب اور شک باقی نہ رہے اور وہ پھر اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہیں، اس کے لئے اپنا مال بھی خرچ کریں اور ضرورت پڑے تو جان تک بھی دیدیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

جب سوچتا ہوں کہ قرآن کریم کے طالب علم اور داعی بن کر ہم نے کتنی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھالیا ہے اور پھر تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں اور آہستہ آہستہ ان ذمہ داریوں کے احساس سے بے نیاز ہو کر سو گئے ہیں۔ یہی سوچ اور احساس مجھے مجبور کر رہی ہے کہ جب بھی اس سٹیج پر آتا ہوں مجھے اپنا اور اپنے پیارے دوستوں کا عمل ایسا نظر نہیں آتا کہ جس پر میں رشک کروں اور اپنی تعریفوں کے قصیدے پڑھوں۔

یہ بات اپنی جگہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم دل کی گہرائیوں میں اترے بغیر قرآنی معاشرہ کی تشکیل اور قرآنی نظام کا عملی قیام ناممکن ہے لیکن جب تک انسان کے سامنے کوئی متعین منزل اور مقصد نہ ہو اس کا سفر سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اگر تو ہم اس بات کے قائل ہوتے ہیں کہ کچھ ہو نہ ہو ہم تو قرآن کریم سے وابستہ ہیں اور ہمیں اس کا اجر و ثواب ملیگا۔ چاہے ہمارے عمل کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ لیکن ہمارا ایمان تو اب یہ ہے کہ اعمال اپنے نتائج سے پرکھے جاتے ہیں یعنی عمل کا نتیجہ ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ عمل ٹھیک ہے یا نہیں۔

اس دور میں ایک طرف ہم ہیں کہ اپنے بزم ہائے طلوعِ اسلام اور انٹرنیٹ و سوشل میڈیا پر علامہ پرویز صاحب کا لٹریچر اور دروسِ قرآن پھیلا رہے ہیں اور دوسری طرف ہزاروں مدرسے ہر سال لاکھوں کی تعداد میں فرقوں سے وابستہ کٹر مذہبی بنیاد

پرست تیار کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر حقیقت پسندانہ انداز میں سوچا جائے تو ہم تعداد اور عمل دونوں میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ وہ جو صحیح سمجھتے ہیں اس پر من وعن عمل پیرا بھی ہیں چاہے ہمارے نزدیک ان کے تمام نظریات باطل ہی ہوں۔ جبکہ دوسری طرف ہم جو صحیح اور اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں اس پر عمل تو دور کی بات کبھی اس پر عمل کرنے کیلئے سنجیدگی سے سر جوڑ کر بیٹھتے بھی نہیں۔

اگر ہم تھوڑی دیر کیلئے اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں اور یکسوئی کے ساتھ سوچیں کہ ہم نے بحیثیت ایک جماعت یا ایک تحریک پرویز صاحب کی وفات کے بعد عملی طور پر کیا کیا ہے سوائے ان کی تحریروں اور تقاریر و دروس قرآن کو انٹرنیٹ پر ڈالنے کے؟ جب بھی کسی نئے فرد کو یہ پیغام پہنچتا ہے تو وہ ایک سچے جذبے کو دل میں لئے اس پیغام کے مرکز کی طرف بڑھتا ہے لیکن یہاں پہنچ کر اس کو مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ دوسری جانب کچھ لوگ ذاتی مصلحتوں کی خاطر اور یا کسی سازش کے تحت یہ نام استعمال کر کے قرآنی اصطلاحات کی نئی نئی تاویلات میں لگ گئے ہیں۔ اور ہمارے کچھ نادان دوست مروجہ مذہبی رسومات کا بوجھ کندھوں سے اتار پھینکنے کے لئے اس نام کو وسیلہ/ بہانہ بنائے ہوئے ہیں، اور اس طرح حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے طلوع اسلام اور پرویز صاحب پر کفر و الحاد اور بے دینی کی تہمتیں لگ رہی ہیں۔ اس صورتحال کا ایک منفی نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے کچھ مخلص دوستوں کو ان منفی پروپیگنڈوں کے جوابات و مباحث میں اپنی توانائیاں صرف کرنی پڑتی ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا قرآنی تعلیم کو عام کرنا ہمارے نظریے کی بنیاد ہے لیکن جب تک سامنے کوئی متعین منزل اور عمل کیلئے کوئی واضح راستہ نہ ہو محض تعلیم برائے تعلیم اور علم بلا عمل قرآن کا منشا ہرگز نہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اگر ہم قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے کبھی تعلیم برائے تعلیم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی تعلیم و تعلم کے ساتھ ساتھ ایک جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ وحی قرآن کا نزول شروع ہونے کے ساتھ ہی اس پر عمل کا آغاز بھی ہوا، اور تاریخ کے علاوہ قرآن کے اوراق بھی اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ نزول قرآن کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت، مکہ میں تبلیغ، مدینے کی ہجرت، جنگی معرکے اور ایک مثالی ریاست کا قیام وقوع پزیر ہوئے۔ اور حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی وفات کے وقت 23 سال کے مختصر عرصے میں دنیا میں ایک زندہ و پائندہ نظام چھوڑا۔

لہٰذا ہمارا یہ کہنا کہ پہلے قرآنی تعلیم عام ہو جائے تو پھر اس کے بعد ہی قرآنی معاشرہ کی تشکیل اور قرآنی نظام کا نفاذ ممکن ہوگا یہ محض بے عملی کا ایک بہانہ ہے۔ کیا حضور ﷺ نے 23 سال صرف قرآنی تعلیم کو عام کرنے میں گذارے تھے یا تعلیم اور عمل ساتھ ساتھ جاری تھے؟

دور حاضر کی مثال لیجئے جب برصغیر میں ایک الگ ریاست بنانے کی بات پہلی بار کی گئی تو کیا اس وقت یہ کہا گیا کہ پہلے ہندوستانی مسلمانوں کو اس نظرئے کا مطلب سمجھانے کیلئے ایک طویل عرصے تک تعلیم دی جائے اور جب تک یہ تعلیم عام نہ ہو

اس وقت تک عملی تحریک کا آغاز نہ کیا جائے اور ریاست کے معاملات سے دور رہا جائے؟ اگر ایسا ہوتا تو خاکم بدھن آج پاکستان کا نام ونشان تک نہ ہوتا اور لوگ آج بھی تعلیم عام کرنے کے نعرے پر قائم رہتے۔ لیکن اس وقت بھی حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی تقلید میں تعلیم اور عمل ساتھ ساتھ چلے اور علم وعمل کی یہی یک جہتی تھی کہ بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام دو دہائیوں سے پہلے ہی ایک زندہ حقیقت کے طور پر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔

تعلیم وتربیت کے بغیر کبھی تحریکیں نہیں چل سکتیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ محض تعلیم برائے تعلیم پر تکیہ کر کے عمل سے غافل ہوجانے کے بجائے تعلیم برائے عمل کا مقصد سامنے ہو اور تعلیم اور عمل دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔ حضور ﷺ نے تعلیم وتربیت کے ذریعے جاں نثاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت تیار کی۔ یہ ایسے افراد تھے کہ قرآن کے عظیم مقاصد کا عملی نفاذ ان کے دل کی آواز اور ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس جماعت کو معاشرے میں بطور خمیر استعمال کیا گیا اور انسانی تاریخ نے وہ حیران کن منظر بھی دیکھا جب بدر کے مقام پر 313 بے سروسامان مسلمان جانثاروں نے اپنے سے کئی گنا بڑے اور ساز وسامان سے لیس مسلح فوج کو شکست دی۔ اگر عملی جدوجہد سے پہلے معاشرے کی اکثریت کو قرآن کی تعلیم دینا ناگزیر ہوتا تو جنگ بدر کے وقت یا تو مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہونی چاہئے تھی اور یا جنگ اور عملی جدوجہد کی ضرورت آنی ہی نہیں تھی کیونکہ جب تک اکثریت اسلام قبول کر کے قرآن کی تعلیم حاصل نہ کر لیتی تب تک کسی عملی جدوجہد کا آغاز نہیں کرنا چاہئے تھا۔

ان گذارشات سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عمل ہونا چاہئے اور اگر ہم ایسا کرنے سے گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں تو ہم قرآن کریم کے رو سے غفلت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اگر ہم قرآنی تعلیمات پر واقعی ایمان رکھتے ہیں اور ان تعلیمات پر مبنی ایک معاشرہ اور نظام کا قیام ہمارے دل کی تڑپ ہے تو ہمیں بغیر کوئی لمحہ ضائع کئے عملی قدم اٹھانے کی تدبیر کرنی چاہئے۔

میرا ایمان ہے کہ آپ اس تحریک سے وابستہ جتنے بھی احباب یہاں بیٹھے ہیں سب کے دل کی تڑپ یہ ہے کہ کسی طرح وہ نظام قائم ہوجائے جس کی مثال ہمیں صرف تاریخ کے اوراق میں بکھری ملتی ہے اور جس خواب کو لے کر بانیان پاکستان نے اس ملک کی بنیاد رکھی تھی لیکن شومئی قسمت کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اس نظام کا عملی وجود نہیں، اے کاش ہمارے حصے میں یہ اعزاز آجائے کہ:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69) اور زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔

عزتمندو: ذخیل یوقرانی رور چاچہ یہ یوزان دیو جماعت ھومرہ کار یہ انٹرنیٹ کڑے دے او خیل ٹول جوندئے دقرانی فکرد خورہ ولود پارہ وقف کڑے دے۔ د پرویز TV جوڑہ ونکے او چلاونکے محترم عزیر احمد صاحب چاچہ زمانہ پہ دے موقعہ پہ پختو جبہ کے دسو خبرو فرمائیش کڑے وو۔

زہ صرف یو شعر ڈالے کوم۔ کار یہ کار کولو کیگی خود کار سڑی پکار دی داچہ ثومرہ نا کاری دہ نو دا زمونگا بے کاری دہ۔

جمیل احمد عدیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان شاء اللہ

اپنے کسی معاصر کی صلاحیتوں کا اعتراف مشکل کاموں میں سے ایک ہے اور اگر وہ ہم عصر ہم عمر ہو تو مذکورہ کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ قارئین آگاہ ہیں بلکہ گواہ ہیں کہ ہم نے ہمیشہ اپنے معاصر ''زیرو پوائنٹ'' والے جاوید چودھری کے لئے کلماتِ تحسین ہی لکھے ہیں، بلاشبہ وہ تعریف کے جائز حق دار ہیں کہ انہوں نے اک زمانہ بڑی جرأت کے ساتھ کلمۂ حق کہا، جی ہاں جابر سلطان کے سامنے، پھر ان کا منظر نامہ + بیانیہ + طرزِ تحریر اتنا دلنشیں ہوتا ہے کہ اسے ایک عمدہ افسانے کی متعدد دلکشیوں سے مزین قرار دیا جا سکتا ہے۔ ویسے ہم نہیں جانتے کہ نسلِ نو کے اس سب سے اہم کالم نگار کے ساتھ کیا واقعہ ہوا ہے کہ ملک جب سے مشرف بہ پرویز ہوا ہے، جاوید صاحب کے ہاں وہ بانکپن نہیں رہا۔

نہ وہ عِشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حُسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

خیر بندہ بشر ہے، سو مجبوریاں، ہزار مسئلے مسائل ہوا کرتے ہیں، گفتنی بھی ناگفتنی بھی۔ غالباً کسی مجبوری کی وجہ سے ہی ہمارے مذکورہ ممدوح عقیدۂ جبر کے مبلغ بن گئے ہیں جس کی ایک مثال 23 ستمبر 2004ء کے روزنامہ ''جنگ'' میں چھپنے والا ان کا کالم ''ان شاء اللہ'' ہے۔ آج ہم ان کے اس کالم کے حوالے سے دو ایک باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

آپ لکھتے ہیں؟ ''ٹی وی خبر نامہ..... میں موسم کی پیش گوئی کرنے والی خاتون یا صاحب بڑے آرام سے کہہ دیتے ہیں آئندہ چوبیس گھنٹوں میں فلاں فلاں علاقے میں بارش ہوگی اور فلاں فلاں جگہ پر موسم خشک رہے گا۔ میں جب بھی یہ سنتا ہوں میرے دل میں خواہش انگڑائی لیتی ہے، کاش یہ اس کے ساتھ انشاء اللہ کہہ دیتے تو پیش گوئی، پیش گوئی نہ رہتی دعا بن جاتی اس میں برکت آ جاتی..... اسی طرح اگر ریلوے، پی آئی اے اور پرائیویٹ بس سروسز کی انکوائری میں بھی ان شاء اللہ کا اضافہ ہو جائے، اگر آپ ریلوے انکوائری فون کریں ان سے پوچھیں، ریل کا رکب پہنچے گی اور وہ جواب میں فرمائیں ان شاء اللہ ریل کا روقت پر پہنچ جائے گی۔ یہ معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی ہوگی۔ اگر ہم ریسکیو 15، فائر بریگیڈ اور ایمبولینس سروس کے عملے کو بھی ''ان شاء اللہ'' کی ٹریننگ دے دیں، وہ ہنگامی کال کے جواب میں فرمائیں، ہم ان شاء اللہ چند منٹوں میں آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں، تو اس سے دلوں کو بہت تسکین پہنچے گی، اسی طرح اگر ہم دفتروں کے نظام اوقات کے ساتھ ان شاء اللہ لکھوا دیں، جج صاحب سائل کو تاریخ دیتے وقت ان شاء اللہ کہہ دیں، ڈاکٹر صاحب مریض کے لئے دوا لکھتے ہوئے، موٹر

مکینک مالک کو گاڑی واپس کرتے ہوئے اور ٹیکسی ڈرائیور سواری کو منزل مقصود تک پہنچانے کا وعدہ کرتے ہوئے ان شاء اللہ کہہ دے تو ان لوگوں کے کام میں اللہ کی رضا اور مدد شامل ہو جائے گی۔''

صاحبو! مکرم جاوید چوہدری کے نقطۂ نظر پر ہم اپنے تحفظات کا اظہار بعد میں کریں گے' پہلے آپ ایک مزے کی بات سن لیں۔ ہمارے تبلیغی جماعت والے بی بے اور میٹھے میٹھے بھائی اپنا پیغام لے کر کسی کے پاس گئے' اپنا کل عندیہ گوش گزار کرنے کے بعد اس زیر تبلیغ سے کہا: آج فلاں مسجد میں مغرب کے بعد بیان ہوگا' تشریف لائیے گا؟ وہ صاحب کہہ بیٹھے' ''انشاء اللہ''۔ اب تبلیغی گروہ میں شامل ایک ذہین ساتھی غالباً ان کی نیت بھانپ کر برجستہ بول اٹھے: ''دیکھئے صاحب! ان شاء اللہ کے دو مفہوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ میرا مکمل ارادہ ہے اگر اللہ نے چاہا تو میں ضرور آؤں گا۔ دوسرا یہ کہ میرا تو بالکل سرے سے کوئی ارادہ نہیں' اگر اللہ نے ایسا چاہا تو مجبوری بن جائے گی آنا ہی پڑے گا۔ کہئے آپ کا کیا ''ارادہ'' ہے؟

دوستو! اب ہم جاوید چوہدری صاحب سے بے حد سادہ' ہر پیچ' ہر باریکی اور ہر فلسفے سے ہٹ کر یہ استفسار کرتے ہیں کہ اگر ریل کار کا ڈرائیور یہ کہتا ہے کہ میں شام چار بجے اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں گا' ان شاء اللہ! اور وہ اپنی غفلت کی وجہ سے گاڑی اتنی لیٹ کر دیتا ہے کہ وہ اگلے روز چار بجے شام پہنچتی ہے' جب آپ اس کا محاسبہ کریں کہ میاں یہ تم نے کیا کیا؟ تو وہ کہے جناب! میں نے کہا تھا ان شاء اللہ' اب اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں چاہا تو جا کر اس سے پوچھیں' میرے ساتھ سوال جواب کر کے اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ تو ہمارے فاضل کالم نگار کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

باقی رہیں اس کلمے کے استعمال سے برکات کی شمولیت' تو معذرت کے ساتھ اس تکیہ کلام کا سب سے زیادہ استعمال ہمارے حکمران اور سیاستدان کرتے ہیں۔ ''ہم اقتدار میں آ کر ان شاء اللہ اس ملک کی حالت یکسر تبدیل کر دیں گے' ہم ان شاء اللہ اسلامی نظام نافذ کریں گے' ہم ان شاء اللہ غربت' بدامنی' دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے.....!'' اب ہوتا کیا ہے وہ انشائیے اقتدار میں آ جاتے ہیں' مگر حالات پہلے سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں' نہ غربت میں کمی ہوتی ہے' نہ امن وامان کی صورتحال میں کوئی مثبت تغیر رونما ہوتا ہے' نہ دہشت گرد اپنے انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان دعاوی کرنے والوں سے پوچھا جائے' کیوں بھئی یہ سب کیا ہے؟ تو وہ پولے سے منہ سے یہ جواب دے دیں کہ اے معترضو! ہم نے کہا تھا ان شاء اللہ۔ اب اگر اللہ کی مرضی ہی نہیں تھی تو ہماری کوششیں بے ثمر ہی رہنی تھیں' چنانچہ نکتہ چینو! یہ تم ہم پر زبانِ طعن دراز کر رہے ہو یا اللہ میاں پر؟ ہم نہیں جانتے جاوید چوہدری صاحب اس کا کیا جواب ارشاد فرمائیں گے؟

اور آگے بڑھئے ایک آدمی پورے عزم کے ساتھ یہ کہتا ہے' ان شاء اللہ میں رشوت خوری کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دوں گا۔ اور وہ اپنے اس دعوے میں ''صادق'' ثابت ہوتا ہے تو اب اس کا کریڈٹ کس کو جائے گا؟ کون اس صورتحال کا ذمہ دار ہو گا؟ ڈاکٹر کہتا ہے ان شاء اللہ میری دوا سے مریض صحت یاب ہو جائے گا' اب اپنے بغلی میڈیکل سٹور سے وہ جعلی دوا نکال کر مریض کو تھما دیتا ہے' جب مریض اگلے جہان سیاحت پر روانہ ہو جائے اور ورثاء ڈاکٹر سے پوچھیں حضرت آپ کی دوا سے مریض تو مر گیا' اس پر وہ ڈاکٹر طیش میں آ کر کہے: ''او کافرو! میں نے ان شاء اللہ کہا تھا۔ اللہ کی مرضی پر معترض ہوتے ہوئے

تمہیں شرم نہیں آتی؟ تو فرمایئے کیا کہا جائے گا بیچ اس مسئلہ کے؟

یہاں جب ان شاء اللہ کے مروج جواز کی غار ریسکیو 15 والوں کو فراہم کر دی جائے گی تو وہ کتنی آسانی کے ساتھ اپنی بداعمالیوں پر پردہ ڈال لیں گے۔ یہی سائبان جب فائر بریگیڈ والوں کے سروں پر تان دیا جائے گا تو انہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ آگ نہ بجھانے کا الزام اپنے سر لیں۔ ایمبولینس والے کی جب جیب گرم نہیں کی جائے گی تو وہ مریض کی خواری یا میت کی رسوائی پر سیدھا سادا جواب دے کر فارغ ہو جائے گا ''میرے مولا کی یہی مرضی تھی''۔

خدارا موسم کی پیش گوئی کرنے والوں کو اپنے علم، مشاہدے اور آلات پر اعتماد کرنے دیں تاکہ ان کی نشر کردہ اطلاعات پر ناظرین و سامعین کو بھی یقین آ سکے ورنہ 'انشاء اللہ' کہہ کر تو ایک لمحے میں ان کی ''چھٹی'' ہو جائے گی اور یہاں ضمناً یہ بھی عرض ہے کہ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا سے جاری ہونے والی خبریں، اطلاعات ہوتی ہیں، دعائیں نہیں۔ اب اگر جاوید چوہدری صاحب کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے نیوز کاسٹر کے حسین لبوں سے یہ پھول جھڑیں کل ان شاء اللہ جنوبی پنجاب میں شدید طوفان آئے گا۔ پشاور اور سرحد کے بالائی علاقوں میں ان شاء اللہ زلزلے کے زبردست جھٹکے محسوس ہوں گے۔ فلاں پہاڑ میں انشاء اللہ تباہ کن آتش فشاں پھٹے گا۔ آج رات ان شاء اللہ ایک سمندری طوفان ساحلی علاقوں کو غرقاب کر دے گا۔ گوادر میں ان شاء اللہ آسمانی بجلی گرے گی، جیکب آباد میں ان شاء اللہ تیز رفتار بگولوں سے تاریخی بربادی ہو گی..... وغیرہ وغیرہ تو پلیز بتایئے ان دعائیہ خبروں سے خلق خدا کو کتنے نفلوں کا ثواب ہو گا؟ اس جہت پر غور کیوں نہیں کیا جاتا کہ بارشیں ہوں یا آندھیاں، موسموں کی خشکی ہو یا تری، ہواؤں کے دباؤ میں کمی ہو یا بیشی، درجۂ حرارت کا بڑھنا ہو یا گھٹنا..... یہ سارے عوامل کسی کے لئے مفید ہوتے ہیں اور کسی کے لئے مضر۔ اب جس کی فصل پک کر تیار کھڑی ہے اسے یہ بشارت سنانی کہ ان شاء اللہ کل سہ پہر ژالہ باری سے سب برابر ہو جائے گا۔ وہ متاثرہ کسان اس ''دعا'' پر ٹی وی والوں کو کیا گولڈ میڈل پیش کرے گا؟ اگر خبروں کو حصولِ برکات کی مقدس غرض سے مناجات یا دعائیں بنانا ہے تو پھر خبر کا متن یوں ترتیب پائے گا۔ 'جن لوگوں کو بارش کی ضرورت ہے، کل ان کے لئے ان شاء اللہ ابرِ کرم کھل کر برسے گا اور جنہیں بارش کی ضرورت نہیں ان شاء اللہ وہ سب بارش کی تعذیب سے محفوظ رہیں گے'۔

بھئی یہ بڑی سیدھی سی بات ہے چاند گرہن لگنا ہے یا سورج گرہن، موسم میں کوئی تغیر رونما ہونا ہے یا زلزلہ آتا ہے..... ان سب طبعی عوامل کی بابت تو موجودہ سائنسی علوم کی روشنی میں عوام الناس کو صرف اور صرف خبر/ اطلاع پہنچانا مقصود ہوتا ہے تاکہ فطرت کے اتار چڑھاؤ کے بارے میں جانکاری حاصل کر کے انسان اپنا لائحہ عمل تیار کرے اور اس کے مضرات سے مامون رہ سکے اور اگر وہ تبدیلی اس کے لئے فائدہ مند ہے تو بھرپور طریقے سے اس سے استفادہ کر سکے۔

جاوید چوہدری صاحب! یہ پیاسی قوم پہلے ہی انصاف کے پانی کے لئے برسوں سے تڑپ رہی ہے اس ترسی ہوئی قوم پر رحم کیجئے، جج صاحب کو پوری منصبی ذمہ داری کے ساتھ سائل کو تاریخ دینے دیجئے، اگر ان شاء اللہ کے مروج مفہوم کے ساتھ تاریخ دی جائے گی تو معینہ تاریخ کو جج صاحب ضمیر کے ہر بوجھ سے آزاد ہو کر ساحلِ سمندر پر اپنے اہل و عیال کے ساتھ

پکنک منا رہے ہوں گے اور سائل بے چارہ عدالتوں میں دھکے کھا رہا ہوگا اور اسے سارا دن بٹھا بٹھا کر سوا تین بجے ریڈر نئی تاریخ دے رہا ہوگا غالباً ان شاء اللہ کہہ کر۔ ذرا سوچئے ججوں اور ریڈروں کو بھی کہیں جوابدہ کرنا ہے یا ان شاء اللہ کے ذریعے ان کو کھلی چھٹی دے دینی ہے؟

یہ سب ہم اس لئے زور دے کر عرض کر رہے ہیں کہ سماج کا کوئی فرد خود کو احتساب سے بالا نہ سمجھ بیٹھے۔ اگر اس سے کچھ اچھا بن آتا ہے تو وہی انعام کا مستحق ہے' اگر اس سے کوئی کوتاہی سرزد ہوتی ہے تو وہی عقوبت کا سزاوار ہے۔ دوسری صورت میں تو نہ وہ شاباش کا استحقاق رکھتا ہے نہ اس پر کوئی حد جاری کی جاسکتی ہے کہ ''کرنے والا'' تو کوئی اور ہے۔ واضح رہے یہاں یہ استدلال قائم کرنا بالکل بے معنی ہوگا کہ ان شاء اللہ کہہ کر اگر کوئی جان بوجھ کر بدعملی کرتا ہے تو وہ خود ذمہ دار ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ۔ اس لئے کہ ان شاء اللہ کا تو مطلب ہی یہ بتایا جاتا ہے' ''اگر اللہ نے چاہا تو''۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کچھ اللہ کے چاہنے کے بغیر ہو جائے خاص طور پر جب کام سے پہلے فاعل بالصراحت یہ کہہ چکا ہو ان شاء اللہ۔ ظاہر بات ہے جو ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے' بندے کی تو کوئی مرضی ہوتی ہی نہیں۔ کیا کہا ہوتی ہے؟ اگر ہوتی ہے تو پھر ان شاء اللہ کی ادائیگی کیا محض رسم ہے؟ اس سے بڑھ کر توہین اور کیا ہوگی کہ مرضی بندے کی ہو' ذمہ دار وہ خود ہو اور زبان سے کہا جائے اللہ کی مرضی۔ کیا بندے سے مراد اللہ ہے یا اللہ سے مراد بندہ ہے؟ اس پیچ میں سے ہمارے صوفی بھائی ہی نکل سکتے ہیں کہ ان کے پاس وحدۃ الوجود کی صورت میں بڑی خاص ترکیب موجود ہے جو اس نوعیت کے ہر مسئلے کا بہترین حل ہے۔

اس سلسلے کو کوئی جتنا چاہے طول دے لے' بنیادی سوال وہی ہے کہ انسان کے اعمال کا ذمہ دار خدا ہے یا انسان خود ہے؟ اگر روایتی انداز میں سوچنا ہے تو پھر آج سے بلکہ ابھی سے تمام انسانوں کو بے خطا اور بے قصور قرار دے کر جزا سزا کے ہر عمل سے اسے بری کر دیں۔ دنیا میں انصاف پہنچانے والے جملہ اداروں پر تالے لگوا دیں اور آخرت میں جنت جہنم ایسے وقیع مقامات کو بھی فی الفور بے فائدہ کہہ ڈالیں۔ عراق میں مسلمانوں پر بش مظالم کے پہاڑ توڑ رہا ہے تو اس میں بھی یقیناً اللہ کی مرضی شامل ہوگی۔ یہاں جن غاصبوں نے مخلوق خدا کا جینا حرام کر رکھا ہے تو ان محترموں کے عقب میں بھی پھر اس عظیم خدا کا ہاتھ کام کر رہا ہوگا۔ یادش بخیر ماضی قریب میں ایک مطلق العنان ''بادشاہ'' اس قوم کو ''عطا'' ہوئے تھے انہوں نے فرمایا تھا نوے دن میں الیکشن کروا کے ان شاء اللہ فوج بیرکوں میں واپس چلی جائے گی۔ پھر ''اللہ'' نے یہ چاہا کہ گیارہ برس اسی طرح بیت جائیں اور چشمِ تماشا نے دیکھا کہ ایسا ہی ہوا اور وہ صاحب آنجہانی ہو گئے مگر وردی اتارنا پسند نہیں کیا۔ اوپر والے کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہمارے فیورٹ رائٹر اور سپیکر مرحوم اشفاق احمد نے بھی اس دور میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے قوم کو دن رات یہی سبق ذہن نشین کروایا کہ جو ہوتا ہے اللہ ہی کی مرضی سے ہوتا ہے' مقبول مومن وہی ہے جو چوں چرا نہ کرے اور راضی برضا رہے۔ ہمارا ایک دم بے طرح جی چاہا کہ موجودہ مقتدر کی بارگاہ میں عرض کریں کہ وہ بلا تاخیر قوم سے صرف ایک جملے پر مشتمل خطاب فرمائیں اور اسے مژدہ سنائیں' ''میں بہت جلد وردی اتار دوں گا ان شاء اللہ''! بس اس کے بعد خاموش ہو جائیں۔ پھر دیکھیں خدا کیا کرتا ہے؟ ساری قوم کو بالعموم چپ لگ جائے گی' بالخصوص ہمارے ایم ایم اے کے قائدین کا تو

ہمیشہ کے لئے منہ بند ہو جائے گا۔ ہمارا نہیں خیال ہمارے یہ مذہبی رہنما ''خدا'' کے فیصلوں پر کبھی اعتراض کریں گے۔

جاوید بھائی! چلتے چلتے ایک صراحت اور کر دیں اب تک جس غربت' ناانصافی اور لاقانونیت پر آپ اپنے سینکڑوں کالموں میں صدائے احتجاج بلند کر چکے ہیں' ذرا تحمل کے ساتھ بتایئے اس واویلے کی کیا ضرورت تھی؟ جب سب کچھ اسی اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے؟ ممکن ہے اس کے جواب میں مکتب کے ملا کی طرح آپ بھی یہی ارشاد فرمائیں کہ ناانصافیاں بھی اللہ کے حکم سے ہو رہی ہیں اور ان ناانصافیوں کے خلاف آواز بھی اللہ کے حکم کے تحت اٹھائی جا رہی ہے۔ سچ کہتے ہیں اس جواب پر ہم لاجواب ہو جائیں گے۔

ارے نہیں صاحب! خدا انکردہ ہم خدا کے منکر نہیں ہیں' نہ اس کے قادر مطلق ہونے کے بارے ہمیں کوئی شک وشبہ ہے۔ ہمیں تو بس اس عظیم ورحیم خدا پر لگنے والے الزام کا دفاع کرنا ہے کہ وہ ہستی متذکرہ تہمتوں سے یکسر پاک ہے۔ اس نے خود اپنی مرضی' خالص اپنے اختیار سے انسانوں کو بااختیار بنایا ہے اور اس کے بااختیار اور قدیر وقادر ہونے کی ہمارے پاس سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ کوئی بے اختیار دوسرے کو بااختیار نہیں بنا سکتا' بااختیار وہی بنا سکتا ہے جو خود بااختیار ہو۔ جی ہاں اسی بااختیار اور بزرگ وبرتر خدا نے اپنی آخری کتاب میں دوٹوک الفاظ میں فرما دیا ہے۔

''ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آ گیا ہے اب جس کا جی چاہے قبول کرلے جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔''

''انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔''

''جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے' وہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔''

ایک مقام پر بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے پوری نسلِ انسانی کو جھنجھوڑا گیا ہے۔

''ان کی تباہی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی۔''

اسی طرح خدا کے قوانین میں ملاوٹ کرنے والے بددیانتوں کی قوم کو یہ وعید سنائی گئی۔

''کہ وہ دنیاوی زندگی میں ذلیل وخوار ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس پر اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مسلط کیا جائے گا۔''

اس مضمون کی قرآن مجید میں کئی آیتیں ہیں' عاد وثمود سے لے کر ابرہہ وابولہب تک کتنے ہی کردار اور کتنے ہی مقام آئے ہیں جہاں قدم قدم پر ہر انسان کو یاد کروایا گیا ہے کہ میرے قوانین کی نافرمانی کا لازمی نتیجہ تمہیں بھگتنا ہوگا' انسان ہی اپنے اعمال وافعال کا مکمل ذمہ دار ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ''اللہ کی مداخلت'' کا کیا کوئی جواز رہ جاتا ہے؟

قصہ تو بس اتنا ہے کہ جب قوموں کی گھٹی میں غلامی کی خُو رچ بس جاتی ہے تو وہ اپنے عملوں کا ذمہ دار اپنی بجائے اپنے رب کو قرار دے کر فارغ ہو جاتی ہیں۔ ظاہر وباہر ہے کہ اس آئیڈیل صورتحال کا سب سے زیادہ فائدہ ''خداوندانِ اقتدار'' کو پہنچتا ہے' سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے' مذہبی پیشواؤں کو پہنچتا ہے۔ عوام بلکہ رعایا راضی برضا ہو جاتے ہیں کہ یہ مقتدر ہم پر اس وقت تک قابض رہیں گے جب تک اوپر والا چاہے گا' امراء تب تلک چھینا جھپٹی سے اکٹھی کی گئی دولت سے آسائشیں خریدتے رہیں گے جب تک ان کو اجازت دینے والا چاہے گا اور ہم عوام تب تک زمین کے سینے سے چمٹے کیڑوں کی طرح برابر رینگتے

رہیں گے جب تک ''اس'' کی مرضی ہوگی۔

خدارا! خدا سے وہ بات تو منسوب نہ کریں جو اس نے کبھی کی نہیں اگر اس خالق اعظم سے دل میں معمولی سا بھی لگاؤ ہے تو اس کے اس قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ (56:24)

یہ ان کے اپنے اعمال کا بدلہ ہے۔

پیارے قارئین! بات ادھوری رہ جائے گی' اگر یہ تصریح نہ کی گئی' پھر ''ان شاء اللہ'' کا حکم کیوں آیا ہے؟ ان شاء اللہ کہے بغیر انسان/مسلمان کے ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ واضح سی بات ہے ''ان شاء اللہ'' کے کچھ ایسے معانی ہوں گے جو متذکرہ صدر نصوص کے موید ہوں ورنہ خاکم بدہن قرآن کو متضاد احکامات کا مجموعہ تسلیم کرنا پڑے گا' نیز مجبوراً ناسخ و منسوخ ایسے لایعنی حیلے تراشنے پڑیں گے۔ روایتوں کو آیتوں پر ترجیح دینی پڑے گی۔

ضروری ہو گیا ہے کہ اس مرحلے میں سورۃ کہف کی ان آیات کا ترجمہ نقل کیا جائے جس کو بطور حوالہ جاوید چوہدری صاحب نے اپنے کالم میں درج کر کے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔

''اور ہرگز ہرگز کسی کام پر یوں نہ کہنا میں اسے کل کروں گا مگر ساتھ ہی ان شاء اللہ کہہ لینا اور اگر بھول جاؤ تو جب یاد آ جائے اس وقت کہہ لینا اور کہتے رہنا کہ مجھے پوری امید ہے میرا رب مجھے اس سے بھی زیادہ ہدایت کے قریب کرے گا۔''

اب ہمارے مکرم حبیب جاوید چوہدری نے نادانستگی میں وہی کام کیا ہے جو عصرِ حاضر کے ننانوے فی صد علماء کر رہے ہیں کہ قرآن کی آیت کو کسی روایت کے ساتھ بریکٹ کر کے تفہیم کی راہیں متعین کرتے ہیں' چاہے اس سعی میں قرآن مجید کے احکامات آپس میں متصادم ہو کر ہنگامہ برپا کر دیں' پروا نہیں۔ اس فارمولے کو لگانے سے پہلے اگر ذہن میں یہ نکتہ رکھ لیا جائے کہ آیات کی پوزیشن قطعی' حتمی اور یقینی ہے' الفاظ کی حد تک' متن کی حد تک اس وادی میں سے تشکیک و ارتیاب کی چیونٹی بھی گزر نہیں سکتی جبکہ روایات کو آپ آیات کی طرح ہر التباس سے منزہ کسی طرح قرار نہیں دے سکتے کہ بہرحال قرآن کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا ہے' روایات کے تحفظ کا وہ ضامن نہیں ہے۔ بے شک اکثریت نے خوش نیتی سے اس ذخیرے کو جمع کیا ہوگا مگر دو تین صدیاں بیچ میں حائل ہونے کے سبب آمیزشیں ہوئی ہوں گی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جامعین نے قریب قریب اسی فی صد روایات کو مسترد کر کے باقی کو رکھا ہے اور جو ہے اس کے متعلق بھی مکمل یقین کے ساتھ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ان کی صحت ہر شبہ سے بالا ہے۔

اس تناظر میں وہ روایات بطور خاص بڑی ہی احتیاط کے ساتھ نظرِ ثانی کی محتاج ہیں جن میں خاتم الانبیاء حضرت اقدس محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی فہمائش کے پہلو برآمد ہوتے ہوں۔ پھر ان روایات کی سیڑھی استعمال کر کے ان آیات کی یوں تفسیر کی جائے کہ اس عظیم اور پاکیزہ ہستی کو کٹہرے میں کھڑا کر کے جرح کی جائے۔ ایک نہیں کئی آیات ایسی ہیں اگر روایات کے پس منظر سے جدا کر کے دیکھی جائیں تو خالص قرآنی سیاق و سباق میں وہ عظمت نبویؐ کی روشن شہادت دیتی ہوئی نظر آتی

ہیں جبکہ دوسرے زاویے یعنی ''روایتی اندازِ نظر'' سے انہیں دیکھا جائے تو آپؐ کی شخصیت کا اور ہی رنگ سامنے آتا ہے۔ ہماری رائے میں حضور ﷺ کی شخصیت کا تقدس سب پر مقدم ہے کیونکہ آپؐ کی ذات کے سرفراز ہونے کا شاہد خود رب کریم ہے۔ قرآن صاحب قرآن کی سیرت کو جس طرح پیش کرتا ہے' وہی قابل قبول ہونی چاہئے' اسی اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہئے نہ کہ ''اپنے'' اور ''غیر'' مؤرخین کی تقلید میں آپؐ کے مرتبے کا تعین کر کے سوئے ادب کا مرتکب ہونا چاہئے۔

اب پہلی بات تو یہ ہے کہ سورۃ کہف کی 24,23 نمبر محولہ آیات میں پس منظر کہیں بیان نہیں ہوا جس کو جاوید صاحب نے بطور اساس کے اپنے مضمون میں پیش کیا ہے۔ ہاں آپؐ کی وساطت سے پوری امت کو ایک خوبصورت سبق ضرور ذہن نشین کروایا گیا ہے کہ ''انشاءاللہ'' کہا کرو۔ یقیناً اللہ کا یہ حکم بھی غیر معمولی حکمت کا حامل ہوگا' شعور کی اس جہت کا ہر زاویہ لازماً حیران کن نور سے معمور ہوگا اور قرآن کے مرکزی نکتے کو مضبوطی اور پختگی عطا کرنے والا ہوگا یعنی ذہن انسانی کو قانون ربانی پر آمادہ کرنے کی کوشش سے بھرپور ہوگا۔

صد افسوس فاضل کالم نویس نے اپنی تحریر میں ''ان شاءاللہ'' کو اسی مفہوم کا لبادہ پہنایا ہے کہ اگر اللہ نے چاہا' اگر اللہ کی مرضی ہوئی یعنی بندے کی مرضی چل نہیں سکتی' چلے گی تو اللہ کی مرضی چلے گی۔ انہیں یہی کہنا چاہئے تھا کہ عام طور پر ''ان'' کا ترجمہ ''اگر'' ہی کیا جاتا ہے اور ''شاء'' کو عموماً ''چاہنے'' سے ہی تعبیر کیا جاتا ہے اور ''اللہ'' کو ساتھ ملا کر ترجمانی یوں کر دی جاتی ہے ''اگر اللہ نے چاہا تو.....'' یہ عمل کرنے کو تو کر دیا جاتا ہے لیکن اس طرف کوئی غور نہیں کرتا کہ اس طرح قرآن حکیم کے مجموعی نظام فکر کی عمارت میں جو دراڑیں پڑتی ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے؟

قرآن مجید سے سچا اور خالص عشق رکھنے والوں نے ''شاء'' کا اس مقام پر ترجمہ لغت کی رو سے ''مشیت'' یا ''قانونِ مشیت'' کر کے اللہ کے دین کی آبرو بچالی ہے۔ اللہ کا نظامِ رحمت ایسے مخلصین پر اپنے لطف و کرم کی مسلسل پھوار سے گلاب کے ارغواں پھول کھلائے۔ سنئے ان میں سے ایک ایسے فیض رساں' ممتاز اور عظیم مفکر قرآن کے زندہ الفاظ کی تلخیص 'ان' کے ایک اور معنی بھی ہیں جنہیں بدقسمتی سے ہمارے ہاں قرآنِ مجید میں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عربی گرامر کی رو سے کہا جائے گا کہ یہ حرف' تعلیل یا سبب بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔ یعنی جس مفہوم کے لئے ہم اردو زبان میں 'چونکہ' استعمال کرتے ہیں' عربی زبان میں ان معانی کے لئے 'ان' بھی آتا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ 'ان' کے ان معانی کی رو سے دیکھئے کہ انشاءاللہ کا مفہوم کیا مرتب ہوتا ہے..... کتب لغت میں ہے 'ان' بمعنی 'اذ' بھی آتا ہے۔ جس کا ترجمہ 'جب' ہے۔ اس مفہوم کے اعتبار سے دیکھئے کہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ وہی انشاءاللہ جو فقدان یقین اور عدم خود اعتمادی کے لئے بولا جاتا تھا۔ اب حتم و یقین اور کامل خود اعتمادی کا آئینہ دار ہو گیا۔ یہ ہے انشاءاللہ کا قرآنی مفہوم۔

سیوطی نے ان بمعنی ''چونکہ'' یا ''جب'' کے سلسلہ میں جو مثالیں دی ہیں وہ بڑی واضح ہیں' مثلاً سورۃ آل عمران کی مشہور آیت:

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ (3:139)

چونکہ تم مومن ہو اس لئے تم دنیا میں سب سے بلند مقام پر ہو گے۔

سورۃ فتح میں ہے:

لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ۙ (48:27)

چونکہ تمہارا پروگرام خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہے۔ اس لئے تم ضرور امن وعافیت سے کعبہ (یا مکہ) میں داخل ہوگے۔

جب حضرت یوسفؑ کے والدین اور دیگر اہل خاندان مصر میں آئے تو آپ نے ان سے کہا:

وَقَالَ ادۡخُلُوۡا مِصۡرَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ﴿۹۹﴾ (12:99)

چونکہ یہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے اس لئے تم مصر میں امن اور آرام سے رہو گے۔

جب حضرت موسیٰؑ کے خسر نے حضرت موسیٰؑ سے زندگی کا اہم معاملہ طے کیا تو ان سے کہا کہ:

سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾ (28:27)

چونکہ میں خدا کے قوانین کا پابند ہوں اس لئے تم مجھے اچھے لوگوں میں سے پاؤ گے۔

اس علمی صراحت کے بعد سورۃ کہف کی آیات 23 اور 24 کا مفہوم کچھ اس طرح سامنے آئے گا۔

''یہ غیب کے علم کی باتیں ہیں انہیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غیب کے سلسلہ میں انسان کی یہ حالت ہے کہ کسی دوسرے کے متعلق تو ایک طرف وہ خود اپنے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ میں کل ایسا ضرور کروں گا۔ انسان جس کام کا ارادہ کرتا ہے اگر اس کے لئے وہ تمام اسباب وذرائع جمع ہو جائیں جو اس کامیابی کے لئے ازروئے قانون خداوندی ضروری ہیں تو پھر وہ ارادہ پورا ہو سکتا ہے۔ اس لئے ارادہ کرنے کے بعد انسان کی توجہ ان اسباب وذرائع کے مہیا کرنے پر مرکوز ہونی چاہئے۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی کڑی بھول جائے اور اس طرح اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو ہمت ہار کر نہیں بیٹھ جانا چاہئے بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ وہ کون سی وجہ ہے جس سے اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی یا تاخیر ہو رہی ہے' اگر یوں متعلقہ قوانین کی کڑیوں کو ایک ایک کر کے سامنے لایا جائے تو منزلِ مقصود تک پہنچنے کا قریب تر راستہ سامنے آ سکتا ہے۔ لہٰذا یقینی طور پر یہی کہنا چاہئے کہ مقصد پیشِ نظر کے حصول کے لئے قانونِ خداوندی کی رو سے جن اسباب وعلل کی ضرورت ہے' اگر مہیا ہو گئے تو پھر یہ کام ہو جائے گا۔'' (ماخوذ۔ مفہوم القرآن' جلد دوم)۔

نتیجہ اس ساری گفتگو سے یہی نکلتا ہے کہ انسان کے سامنے بالعموم دو طرح کے معاملات ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن کے متعلق وہ اپنے تجربے' علم اور مشاہدے کے بعد قریب قریب نہیں بالکل قطعی نتیجے پر پہنچ چکا ہے' مثلاً سادہ سی بات ہے اسے معلوم ہے کہ سورج نامی ایک چیز اس کے نظامِ شمسی سے وابستہ ہے اور یہ ستارہ زمین کے حوالے سے طلوع وغروب کا ایک سسٹم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کے ظاہر ہونے اور چھپنے کے متعلق وہ کسی تذبذب کا شکار نہیں ہوگا اور کامل حتم ویقین کے ساتھ کہہ دے گا کہ کل فلاں خطے میں اتنے بج کر اتنے منٹ پر سورج نکلے گا۔ یا اس وقت پاکستان میں یہ وقت ہوا ہے' سورج اس پوزیشن میں ہے اور عین اس وقت امریکہ میں ان ہر دو حوالوں سے صورتحال یہ ہے اور یہ سب انفرمیشن اس نے قانون خداوندی کے بغور مشاہدے سے حاصل کی ہے۔ اب یہی بات جب وہ انشاء اللہ کے اضافے کے ساتھ کہے گا تو اس کی مراد یہ ہوگی' چونکہ اصولِ ربانی یہی ہے اس لئے ایسا ہی ہوگا۔ رہی وہ باتیں جن کے بارے ابھی اسے پوری طرح علم نہیں' معلومات

ناقص ہیں، تجربات خام ہیں، مشاہدات پختگی کے مراحل طے نہیں کر پائے، عقل کو مکمل طور پر بروئے کار نہیں لا سکا تو اس کی انشاء اللہ کہنے کے پیچھے ایک غیر متزلزل عزم کارفرما ہوگا کہ میں اس شے کی بابت قوانینِ خداوندی کی پیہم اتباع کرتے ہوئے ایک دن ضرور ادراک حاصل کر کے رہوں گا۔ اس کی لم اور کنہ لازماً میری دسترس میں آ کر رہیں گی۔ ہاں اسباب کو بائی پاس کر کے ایک ایجنسی چیز کی حقیقت کو طرفۃ العین میں منکشف کر سکتی ہے اور وہ ہے وحی آسمانی لیکن ایک تو وہ خالص موہبت الٰہی ہے کسی اکتساب کو آزما کر اللہ سے رابطے استوار نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کے بعد وحی تو کیا اس کے کسی مترادف نام سے بھی خدا اور بندے کے بیچ ''مکالمہ ومخاطبہ'' نہیں ہو سکتا اور ختمِ نبوت کا یہی قرآنی مفہوم ہے۔ ہاں خوش قسمتی سے مومنین+متقین کے لئے اللہ کی آخری وحی اپنی مکمل حالت میں آج بھی قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ گہرے تدبر اور پورے اخلاص کے ساتھ اگر اس مجموعے سے رشتہ قائم کر کے رہنما اصولوں کی روشنی میں کائناتی قوتوں کو اسیر اور تسخیر کر لیا جائے تو ہزاروں اسرار آج بھی بے نقاب ہونے کو تیار ہیں۔ اور یہ جذبہ، یہ ارادہ انشاء اللہ کی ادائیگی میں چھپا ہوا ہے ورنہ تقدیر کے روایتی مفہوم کو مدنظر رکھ کر یہ کلمہ ادا کرنا ہے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا: کل انشاء اللہ مشرق سے سورج طلوع ہوگا'۔ کہ اگر اللہ نے چاہا تو مشرق سے آفتاب نمودار ہوگا اور اگر اللہ کا پروگرام بدل گیا تو ہو سکتا ہے وہ شمال یا جنوب سے ظاہر ہو جائے اب اللہ کی چاہت کو آزمانا کیا مشکل ہے' کوئی صاحب یہ کہہ کر دیکھ لیں کہ کل سورج مغرب سے انشاء اللہ طلوع ہوگا اور مشرق میں غروب ہوگا۔ وہ یہ ہزار بار کہہ لیں پر ہوگا کیا وہ مشرق سے ہی طلوع ہوگا اور مغرب میں ہی غروب ہوگا۔ اس لئے کہ خدا نے اپنی ''چاہت'' متعین کر دی ہوئی ہے یعنی اپنی مشیت غیر مبہم الفاظ وعمل میں واضح کر دی ہوئی ہے۔ لہٰذا جن قوانین خداوندی کا انسان شعور حاصل کر چکا ہے ان کے متعلق اسے پورے بھروسے کے ساتھ انشاء اللہ کہنے دیں کہ میرے رب کے قانون مشیت کے مطابق یہی ہوگا اور لکھ لیں عزتوں والا رب اپنے اس بندے کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائے گا' اسے کبھی کفار (منکرینِ قوانینِ خداوندی) کے سامنے رسوا نہیں کرے گا۔ یہ بھی اس کی مشیت ہے' اٹل قانونِ مشیت۔

اب دونوں مفاہیم میں زمین آسمان کا تفاوت ہے اول الذکر معانی کی رو سے انسان کا مجبور محض ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کا سارا کیا دھرا چپ چاپ خدا کے کھاتے میں چلا جاتا ہے' یوں سزا جزا کا سارا عظیم الشان نظام آنِ واحد میں زمیں بوس ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نہ حساب کتاب' نہ میزان' نہ شہادت' نہ مقدمہ' نہ قیامت' نہ جنت' نہ جہنم۔ دنیا و آخرت معاذ اللہ بازیچۂ اطفال بن جاتی ہیں اور اس کے برعکس ساری ذمہ داری انسان کے کندھوں پر آتی ہے اور وہ اپنے اعمال کے سلسلہ میں اس دنیا میں اور اس دنیا کے بعد پوری سنجیدگی کے ساتھ جواب دہ نظر آتا ہے۔ ویسے اس میں اکیلے جاوید چوہدری کا کیا قصور ہے۔ عہد موجود میں کم از کم ساری پاکستانی قوم کا یہی مسئلہ ہے۔ ہر فرد اپنے حصے کے منفی اعمال کسی اور کے سر منڈھ کر اسے ذمہ دار قرار دینے میں عافیت کا محفوظ تر گوشہ تلاش کر چکا ہے اور دوسروں کے کارناموں کا سہرا اپنے سر باندھ کر ہر قسم کا کریڈٹ لینا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا ہے۔ اس تناظر میں رہی سہی کسر ہمارے یہ دانشور پوری کر رہے ہیں کہ اے مسلمانو! ''خاموش خدا'' جو موجود ہے۔ انشاء اللہ کہو اور سب کچھ اس کے کھاتے میں ڈال کر صاف بچ نکلو اگر اس کی ضمانت چاہتے ہو کہ وہ غضب میں نہیں آئے گا تو آستانوں پر نذر نیاز اور چندے تحائف لے آؤ' بے فکر رہو وہ اپنی جبیں پر کوئی بل نہیں لائے گا۔ انشاء اللہ!

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلامی مملکت صفات خداوندی کو عملاً جاری کرنے کے لئے قائم کی جاتی ہے

بانیٔ تحریک طلوعِ اسلام جناب محترم پرویز صاحب رسالہ طلوعِ اسلام خود ایڈٹ فرمایا کرتے تھے، اس رسالہ کے متعلق عام شہرت تھی، اور ہے، کہ اس رسالہ کا علمی معیار بہت بلند ہے اور اس کا مطالعہ کرنا عام سطح کے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس رسالہ کے قارئین کی طرف سے اعتراضات اور سوالات بھی آتے تھے جن میں سے جو سوالات جواب کے قابل ہوتے تھے۔ محترم پرویز صاحب ان کے جواب بھی دیدیتے تھے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام میں رسالہ کے ایک قاری نے سوال کیا کہ میں عرصہ دراز سے طلوعِ اسلام، رسالہ ترجمان القرآن، اور میثاق کا مطالعہ کرتا آرہا ہوں۔ مجھے یہ تینوں رسالے بہت پسند ہیں اور میں ان تینوں رسالوں کے مضامین سے اتفاق کرتا ہوں۔ ان تینوں رسالوں کا مقصد اقامتِ دین ہے۔ پھر انہوں نے تحریر فرمایا کہ جب ان تینوں تحریکوں کا مقصد اقامتِ دین ہے تو یہ بہت بہتر ہوگا کہ یہ تینوں تحریکیں مل کر کام کریں۔ اس سے آپ کی جدوجہد جلد کامیاب ہوجائے گی۔ اس مستفسر کے خط سے ان کا خلوص اور ان کی درمندی ظاہر ہورہی تھی۔ اس خط کے جواب میں محترم پرویز صاحب نے ان صاحب کو یہ تحریر فرمایا کہ میں آپ کو ترجمان القرآن اور میثاق کے مطالعہ کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں دیتا۔ البتہ رسالہ طلوعِ اسلام کے سلسلہ میں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اس کا مزید مطالعہ کرنا بند کردیں۔

محترم پرویز صاحب نے اس سائل کو جو جواب تحریر کیا وہ بالکل درست تھا۔ جو شخص عرصہ دراز سے ان تینوں رسالوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کرتا ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ وہ تحریک طلوعِ اسلام کے بلند مقاصد کو سمجھتا ہی نہیں۔ ہم نے اس وقت اس مسئلہ کو اس لئے اٹھایا ہے کہ اس وقت بھی رسالہ طلوعِ اسلام کے بہت سے قارئین اس نکتہ کی پوری طرح گرفت نہیں کررہے ہیں۔ اس مضمون میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اس وقت اقامتِ دین کی واحد تحریک طلوعِ اسلام ہے۔ دیگر تمام جماعتیں تحریکیں مذہب کو ہی دین کا لباس پہنا کر، کام نکالنا چاہتی ہیں۔ ان تحریکوں کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ جس اساس پر وہ اقامتِ دین کرنا چاہتے ہیں، وہ خود مذہب کی اساس ہے۔ وہ دین کی اساس نہیں ہے۔ اور

نہ ہی وہ قابل عمل ہے۔

زندگی (The Life) ہزاروں ، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی جمادات کی سطح پر پہنچی بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ (32:7) تخلیق انسانی کی اسکیم کا آغاز مٹی سے ہوا۔ پھر زندگی آہستہ آہستہ، رفتہ رفتہ، ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی یعنی ایک صلاحیت واستعداد عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یہ توانائی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روح خداوندی کہلاتی ہے اور جب یہ توانائی انسانیت کو بطور ایک نوع کے ملتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بطور ایک نوع، مجموعی طور پر ملتی ہے تو یہ نفس کے لفظ سے پکاری جاتی ہے اور یہ استعداد و توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے تمیز کرتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھتے ہیں لیکن قرآن کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مرکب گردانتا ہے۔ قرآن کریم میں روح کا لفظ بیس (20) مقامات پر آیا ہے۔ اس میں سے سترہ (17) مقامات پر روح کا لفظ وحی، وحی لانے والا، کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ تین مقامات پر روح کا لفظ ایک توانائی عطا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (32:9، 38:72، 15:29)۔

ہمارے علمائے کرام نے ان تین آیات کے سمجھنے میں یہ غلطی کی ہے کہ وہ روح اور نفس کے باریک فرق کو Detect نہیں کر سکے اور انہوں نے ساری دنیا کے دیگر مذاہب سے متاثر ہو کر انسان کی اس استعداد کو ''روح'' کے مفہوم میں ہی لے لیا۔ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ انسان کے جسم کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز بھی موجود ہوتی ہے، خواہ اس کو Define کیا جا سکے یا نہیں۔ لیکن ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ گواہ ہے۔ جب آپ اپنے بیٹے کے پاس ہونے کی خوشخبری سنتے ہیں تو آپ خوش ہوتے ہیں تو یہ آپ کا جسم خوش نہیں ہوتا بلکہ آپ کے ساتھ جو یہ دوسری شے ہے وہ خوش ہوتی ہے۔ جب آپ کسی واقعہ کی وجہ سے خوفزدہ ہوتے ہیں تو آپ کا جسم خوفزدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسری چیز جو آپ کے ساتھ ہے وہ خوفزدہ ہوتی ہے۔ اس دوسری شے کو قرآنِ کریم نے نفس کہا ہے۔ لیکن ہمارے علمائے کرام اور دیگر مذاہب کے علماء اس کو روح انسانی کہتے ہیں۔ نفس ماننے والے، اور روح ماننے والے دونوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اس کی نشوونما کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ روحِ انسانی کا قائل ہی نہیں ہے اس لئے اس نے روح کی تربیت کے طریقے بھی نہیں بتائے بلکہ اس کے Develop کرنے کے طریقے علماء وصوفیاء کرام نے خود ہی وضع کئے ہیں۔ مسلمانوں نے اس روح اور روحانیت کو نشوونما دینے کا نام تصوف، اور اس کے ماننے والوں کا نام صوفیاء رکھا۔ ہم بھی سہولت کی وجہ سے اس کا اسی نام سے ذکر کریں گے۔

صوفیائے کرام نے روح کے متعلق جو عقائد وضع کئے اور اس کی تربیت کے جو طریقے وضع کئے وہ قوم کو ذلیل وخوار کر

دیتے ہیں۔ ان کے عقائد کا ملخص یہ ہے کہ یہ کائنات خارج میں کوئی وجود نہیں رکھتی۔ اس کے بارے میں غالب کے دو مشہور شعر ہیں۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

اصطلاح میں اس عقیدے کو وحدت الوجود، اور انگریزی میں Pantheism کہتے ہیں۔ فارسی زبان اور اردو زبان کی شاعری اس عقیدہ کے متعلق اشعار سے بھری پڑی ہے اس کے علاوہ یہ حضرات حواسِ خمسہ سے حاصل کردہ علم کو علم ہی نہیں گردانتے بلکہ اس پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ یہ حضرات صرف اس علم کو علم سند کرتے ہیں جو باطنی ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم صرف اس علم کو علم قرار دیتا ہے جو انسانی حواس وشعور کے ذریعے حاصل ہوتا ہے (17:36)۔ ان حضرات نے روح کی پرورش کا ذریعہ پرستش کو قرار دیا اس لئے ان حضرات نے نوافل، اعتکاف، تہجد، اور ادووظائف پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ اس کے لئے کسی معاشرہ ونظام کی ضرورت نہیں، یہ رسومات ہر جگہ اور ہر نظام میں ادا کی جاسکتی۔ کیونکہ انہوں نے اپنی نجات کے لئے یہ راستے مقرر کر لئے ہیں اس لئے ان کو اسلامی نظام کے قیام کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے برخلاف آپ نفس کے تصور کو لیں جو قرآن کا اپنا مقرر کردہ تصور ہے۔ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ جب ایک بچہ تولید ہوتا ہے تو وہ جسم اور اس کے ساتھ اس کے نفس کا مرکب ہوتا ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں کی پرورش کرے۔ انسان کا جسم طبعی قوانین پر عمل کرنے سے پرورش پاتا ہے۔ یہ ایک مشین کی مانند ہے۔ آپ اس کو احتیاط سے استعمال کریں گے، طویل عمر پائیں گے۔ اگر کوئی شخص اس کو بُری طرح استعمال کرتا ہے جلد مر جاتا ہے۔ اچھی غذا، اچھے ماحول سے اس جسم کی اچھی پرورش ہوتی ہے اس کے برخلاف اس کے نفس کی پرورش کے لئے قرآنِ کریم نے دو طریقے مقرر کئے ہیں۔ اس نفس کی ترقی کا ایک طریقہ تو یہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جو مستقل اقدار عنایت فرمائی ہیں آپ اس پر عمل کریں۔ ہر قدر پر عمل کرنے سے نفس انسانی میں بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ قرآن نے فرمایا: اِعْدِلُوْا ۟ اِعْدِلُوْا ۟ ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۠ (5:8) ترجمہ، عدل کرو کہ یہ تقوی کے قریب ہے۔ جو شخص عدل کرے گا اس کے نفس میں یقیناً ترقی ہوگی۔ قرآن کریم نے فرمایا: الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (92:18) ترجمہ: جو شخص اپنا مال دوسروں کو دے گا اس کے نفس میں تزکیہ ہوتا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشادِ عالی ہے: وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ (35:18) جو شخص دوسروں کی نشوونما کرتا ہے اس سے اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ قرآن کی یہ مستقل اقدار قرآن میں بکھری پڑی ہیں۔ ہر قدر پر عمل کرے گا سے نفس میں ترقی ہوتی ہے نفس کی یہ ترقی کوئی خفیہ یا پوشیدہ چیز نہیں ہوتی بلکہ جس طرح جسم کی ترقی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک انسان کے کردار، اور اس کی سیرت کی پختگی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی نفس کتنی مضبوط ہو چکی ہے۔

نفس انسانی کو مضبوط کرنے کا دوسرا طریقہ صفاتِ خداوندی پر عمل کرنا ہے۔ صفاتِ خداوندی کا موضوع بہت طویل ہے۔ ہم اس موضوع پر اتنی ہی گفتگو کریں گے، جتنی گفتگو اس بارے میں ضروری ہے۔ صفاتِ خداوندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور انسانیت اپنے آپ کو ان تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اس دنیا کا سارا نظام اس طرح رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبورِ محض نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کا ظہور کا کوئی موقع نہ رہتا۔ مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم ان صفات کا ظہور نہ ہوسکتا۔ حالانکہ عالم کو پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان، جو اللہ تعالیٰ کو فاعلِ مختار مانتا ہے انجام کار اس کے علاوہ کوئی دوسری غرض نہیں بتا سکتا۔

قرآنِ کریم میں صفاتِ خداوندی کو اس وجہ سے تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کے قوانین کو صفاتِ خداوندی کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس ریاست کے قوانین کی اساس صفاتِ خداوندی ہوتی ہیں۔

''نفخِ روح'' سے صفاتِ خداوندی کی potentiality انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان میں وہ ساری صلاحیتیں علیٰ حدِّ بشریت پیدا ہو جاتی ہیں جو ذاتِ باری تعالیٰ میں موجود ہوتی ہیں۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اپنے میں اجاگر کرے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کی ربوبیت کرے۔ اللہ تعالیٰ رازق ورزاق ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے انسانون کو رزق فراہم کرے۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے ہر شخص کا فرض ہے کہ ہمیشہ عدل سے کام لے جس قدر صفاتِ خداوندی اپنے اندر پیدا کی جائیں گی یا جس قدر ان پر عمل کیا جائے گا، اسی قدر قُربِ خداوندی حاصل ہوتا چلا جائے گا۔

اسلامی ہیئت اجتماعیہ اس لئے قائم کی جاتی ہے کہ اس ہیئتِ اجتماعیہ میں صفاتِ خداوندی پر زیادہ سے زیادہ عمل کیا جاسکے اور اس میں مستقل اقدار بھی جاری ہوں۔ مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی ایک ہی چیز ہوتی ہیں ان دونوں پر عمل کرنے سے نفسِ انسانی از خود نشوونما حاصل کرتا چلا جاتا ہے اس ریاست کا مقصد نفسِ انسانی کی تکمیل ہے۔ اس میں ریاست اور شہریوں کے مقاصد زندگی ایک ہو جاتے ہیں۔ غیر اسلامی نظام میں نفس کی نشوونما کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں خدا کے عطا کردہ قوانین کی بجائے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کی جاتی ہے۔ اسلامی نظام چونکہ صفاتِ خداوندی اور مستقل اقدار پر استوار ہوتا ہے اس لئے انسانی معاشرہ کی تشکیل صحیح خطوط پر ہوتی چلی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ نفس انسانی کا ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے پھر پرستش کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ صرف اور صرف اسلامی نظام ایسا نظام ہوتا ہے جس میں جسم اور نفس دونوں کی نشوونما ہو جاتی ہے۔

دین کی اساس نفس انسانی پر ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی نفس کی نشوونما کرنا چاہتا ہے اور وہ مستقل اقدار پر عمل کرتا ہے۔

اسلامی مملکت میں ایک عام شہری حرام مال نہیں کھاتا کیونکہ حرام مال کھانے سے اس کے نفس پر برا اثر پڑتا ہے اس مملکت کے تمام شہری حد درجہ عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔ اس مملکت میں عوام اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتے ہیں تاکہ اس کا نفس مضبوط ہو (92:18)۔ اس ریاست کے شہری یہ امور اپنی نفس میں استحکام پیدا ہونے کی وجہ سے کرتے ہیں لیکن ان کا اثر اور ان کا By-Product معاشرہ پر یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرہ خود بخود بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس معاشرہ میں کوئی مال حرام نہیں کھاتا۔ کوئی ناانصافی نہیں کرتا۔ نفس کے عقیدہ کی وجہ سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، روح کے عقیدہ کی وجہ سے وہ حاصل نہیں ہوتے۔

ہمارے ہاں جو جماعتیں اقامت دین کے لئے اٹھی ہیں۔ وہ سب روح، روحانیت اور پرستش کی قائل ہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں بنوعباس کے دور سے ایرانی، یونانی افکار کے ماتحت روح کا تصور مسلمانوں میں سرائیت کر گیا تھا اور اپنی نجات کے لئے پرستش کو ذریعہ قرار دے دیا گیا تھا۔ اس لئے اقامتِ دین کی کوئی اہمیت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ جو جماعت بھی اقامت دین کی داعی ہوگی اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ روح اور روحانیت کے تصور کو بالکل قرآن کے خلاف قرار دے، اور اسلامی نظام کی اطاعت کو ہی عبادتِ خداوندی شمار کرے۔ اس وقت جو جماعتیں اقامت دین کی داعی ہیں وہ اسلامی نظام کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی نہیں گردانتی بلکہ وہ پرستش کی رسومات کو ہی عبادتِ خداوندی گردانتی ہیں۔ یہ وہ امتیازات ہیں جن کا وہ مستفسر جس کو پرویز صاحب نے رسالہ طلوعِ اسلام کے مطالعہ سے منع کیا تھا، وہ اس کا ادراک نہیں کر سکا۔

اقامتِ دین کے لئے جو جماعت بھی کام کرنا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآنی اصطلاحات کو قرآنی معانی پہنچائے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہونے کے بعد قرآن کی تمام اصطلاحوں کو غیر قرآنی معانی پہنائے گئے۔ قرآن کریم کی دو بنیادی اصطلاحیں صلوٰۃ وزکوٰۃ بڑے وسیع مفاہیم کی حامل ہیں۔ قرآنی نظام کی اساس عمارت ہی ان دو اصطلاحوں پر استوار ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اس موجودہ دور میں جو صلوٰۃ وزکوٰۃ پر عمل کیا جاتا ہے اس کا کوئی تعلق قرآنی صلوٰۃ وزکوٰۃ سے نہیں بنتا۔ نماز کا معاملہ بہت Touchy ہے ہم اس پر بہت مختصر بات کریں گے۔

دین کو مذہب میں تبدیل کرنے میں لفظ عبادت کا غلط مفہوم لینے نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے علماء نے اس کے معنی پرستش کئے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے آیات نمبر (39:66، 39:14، 39:17، 43:45، 43:81) اور دیگر بیشمار آیات میں عبادت کا ترجمہ پوجنا کیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ ہمارے علماء چونکہ اقامتِ دین کے مخالف ہیں اور پوجنے کے لفظ کو بھی زیادہ پسند نہیں کرتے اس لئے عبادت کا ترجمہ ہر جگہ بندگی کر دیتے ہیں۔ بندگی ہندی زبان اور فارسی زبان دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں اس کے معنی پوجنا ہیں اور فارسی میں اس کے معنی اطاعت کرنا ہے بندگی کا لفظ استعمال کرنے سے بات مبہم رہتی ہے کہ مترجم دین کا داعی ہے یا مذہب کو درست سمجھتا ہے۔

عبادت کا مادہ عبد، ع ب د ہے اور اس کا مصدر عبادت ہے۔ عبد کے معنی غلام کے ہوتے ہیں، اس کے معنی پوجنے والا (پرستندہ) نہیں ہوتے قرآن کریم نے سورہ بقرہ میں جہاں قصاص لینے کا حکم دیا ہے۔ وہاں ارشادِ عالی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ (2:178) ترجمہ: اے ایمان والو، مقتولین کے بارے میں حکم قصاص تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ اس آیۂ کریمہ میں ''اَلْحُرُّ'' اور ''الْعَبْدُ'' کو ایک دوسرے کے مقابل استعمال کیا گیا ہے۔ آزاد اور غلام، غلام اپنے مالک کی پرستش نہیں کرتا بلکہ وہ اس کی اطاعت اور محکومی اختیار کرتا ہے۔ اس لئے عبادت کے معنی محکومی کے ہیں۔ پرستش کے ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتے۔

(2) قرآن کریم نے خدا کی عبادت کی اصطلاح ان معنوں میں استعمال کی ہے جن معنوں میں آج کل حکومت کا لفظ استعمال ہوتا ہے سورہ کہف میں ارشاد ہے: وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ (18:110) ترجمہ: ان کو چاہئے کہ وہ اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26) ترجمہ: وہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ان دونوں آیات میں عبادت اور حکم ایک دوسرے کے متبادل استعمال ہوئے ہیں جس سے واضح ہے کہ عبادت کے معنی محکومیت ہوتے ہیں۔ پرستش کے نہیں ہوتے۔

(3) سورہ یوسف میں ارشادِ عالی ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ حکومت اللہ کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی اور اس کے بعد ارشاد ہے: اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40) ترجمہ: اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور کی عبودیت (حکومت) اختیار نہ کرو۔ اس ایک ہی آیت کے ایک حصہ نے دوسرے حصہ کی وضاحت کرتے ہوئے حکومت اور عبادت کے الفاظ ایک ہی معانی میں استعمال کئے ہیں۔ اللہ کی عبادت کے معنی اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔

(4) جب حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارون نے فرعون اور قومِ فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے جواب میں کہا: اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿۴۷﴾ (23:47) ترجمہ: کیا ہم ایمان لے آئیں اپنے برابر کے ان دونوں آدمیوں پر کہ ان دونوں کی قوم ہماری محکوم ہے۔ بنو اسرائیل فرعون اور قومِ فرعون کی پرستش نہیں کرتی تھی بلکہ وہ ان کی محکوم تھی۔

(5) فرعون نے حضرت موسیٰ کے سامنے وہ احسانات شمار کئے جو اس نے ان کی قوم پر کئے تھے اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے نیم طنزاً اور نیم مزاحاً فرمایا کہ تمہارا یہ بھی تو ایک احسان ہے کہ تم نے اُن اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ (26:22) ترجمہ: کہ تم نے بنی اسرائیل کو (اپنا) محکوم بنا رکھا تھا۔

(6) سورہ الذاریات میں ارشاد ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (51:56) ترجمہ: میں نے

جن وانس کو اس لئے پیدا کیا ہے تا کہ وہ میری بندگی کریں۔ شیخ الہند نے اس آیت میں عمداً عبادت کا ترجمہ بندگی کیا ہے جس کے ہندی زبان میں پرستش معنی ہیں اور فارسی میں اس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں۔ اس آیت میں عبادت کا واضح مطلب یہ ہے کہ تا کہ تم ہماری محکومیت اختیار کرو۔ تمہاری تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ تم ہماری محکومیت میں ساری زندگی بسر کرو۔ ہمارے علماء کرام اس آیت کے معنی یہ کرتے ہیں تا کہ تم ہماری پرستش کرو۔ لیکن اس آیت میں عبادت کے معنی پرستش کسی طور پر بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ جو لوگ اقامتِ دین کے داعی ہیں وہ بھی یہی ترجمہ یعنی پرستش کرو کرتے ہیں۔ لفظ جن کی وضاحت کو فی الحال چھوڑ دیں۔ اگر تخلیق انسانی کی غرض یہ رسوماتِ پرستش ادا کرنا ہیں۔ تو ان رسومات کی ادائیگی چوبیس (24) گھنٹے نہیں ہو سکتی۔ یہ صورت تو نہیں ہو سکتی کہ چوبیس گھنٹے ہر سانس میں پرستش کی بات کرتے چلے جائیں۔ اس کے علاوہ اور ضروریاتِ زندگی بھی ادا کی جانی ضروری ہیں۔ جتنی دیر دیگر ضروریاتِ زندگی کے امور انجام دیئے جائیں گے۔ وہ وقت انسان کی تخلیق کے مقصد کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔ ایک عبادت کے غیر قرآنی مفہوم کو اختیار کرنے سے تخلیق انسانی کی غرض وغایت ہی دوسری ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمایا تھا: وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13) ترجمہ: ساری کائنات تمہارے زیر تسخیر کر دی گئی ہے تمہیں چاہئے کہ تم کائنات کی قوتوں کو استعمال کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرو۔ یہاں مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ مسجد یا مزار کے ایک کونے میں بیٹھے نوافل پڑھے جا رہے ہیں۔ درود تاج اور درود لکھی کے ورد ہو رہے ہیں۔ دربار پر کچھ ٹیمیں یا پارٹیاں ہیں جنہیں کچھ رقم دے کر آپ آیۂ کریمہ کا عمل کرا سکتے ہیں۔ یہ سب صرف اس وجہ سے کہ یہ سب حضرات اقامتِ دین کے مخالف ہیں۔ ہمارے علماء عربی ادب کے ماہر ہوتے ہیں۔ عربی ادب پر بہت گہری نظر رکھتے ہیں لیکن عمداً، دانستہ، عبادت کا ترجمہ محکومیت کی بجائے پرستش کرتے ہیں۔ اقامتِ دین کی داعی سب جماعتیں اسی صف میں کھڑی ہیں۔

قرآنِ کریم کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ فرقہ بندی مذہب میں ہوتی ہے دین میں فرقہ بندی نہیں ہوتی۔ فرقہ بندی کی بنیاد فقہ پر ہوتی ہے الگ الگ فرقوں سے الگ الگ فقہ وجود میں آتے ہیں۔ جو حضرات فرقوں اور مختلف فقہوں کے باوجود اقامتِ دین چاہتے ہیں وہ اقامتِ دین کی حقیقت سے واقف نہیں۔

اسلامی مملکت قرآنِ کریم کی بلند اقدار و تصورات کو اپنے دور کے مطابق جاری کرتی ہے۔ ہر اسلامی مملکت اپنے قوانین خود وضع کرتی ہے۔ اس دور کی اسلامی مملکت کو سابقہ دور کی اسلامی مملکت کے قوانین سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس سابقہ دور کے قوانین کی اطاعت کرنی۔ اس دور کے لوگوں کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ہماری موجودہ شریعت اور فقہ بنو عباس کے دور کے وضع کردہ ہیں۔ بنو عباس کے دور کی ملوکیت اسلامی مملکت نہیں تھی۔ اور نہ ہی ان کے دور کے وضع کردہ قوانین اسلامی قوانین تھے۔ جب آپ اسلامی مملکت قائم کریں گے تو وہ اسلامی مملکت، اس دور کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر، قرآن کریم کی

روشنی میں قوانین وضع کرتی چلی جائے گی۔ وہ قوانین ہی اس کی شریعت اور اس کا فقہ ہوں گے۔ ان قوانین کی اطاعت ہی عبادتِ خداوندی ہوگی قرآنی قوانین کی اطاعت سے نفسِ انسانی میں از خود نشوونما ہوتی چلتی ہے۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ (2:286)، قرآنی قوانین کی اطاعت سے نفس انسانی ترقی حاصل کرتی ہے۔ سیکولر حکومتوں کے قوانین معاشرہ کی تعمیر میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے، اس کے برعکس قرآنی احکامات کی اطاعت سے معاشرہ خود بخود اصلاح پذیر ہوتا جاتا ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی تیرہ سو سال بعد ایران کے علماء نے، بڑی جدوجہد اور ہزاروں آدمیوں کی قربانیوں کے بعد اسلامی انقلاب برپا کیا تھا۔ میں نے بھی اس اسلامی انقلاب سے بڑی توقعات اور خوش فہمیاں وابستہ کی تھیں۔ لیکن یہ انقلاب اس لئے ناکام ہوا۔ کہ وہاں کے علماء نے نہ تو پرستش کو ختم کیا اور نہ ہی اسلامی نظام کی اطاعت کو عبادت خداوندی کا درجہ دیا۔ ایران کے انقلاب کے ناکام ہونے کے اسباب کے متعلق تفصیل سے تحریر کرنا بہت ضروری بات ہے، اور اس کی ناکامی کے اسباب تحریر کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ رسالہ فرقہ بندی کے خلاف ہے اور فرقہ بندی کے متعلق کچھ تحریر نہیں کرنا چاہتا۔ اس لئے ہم اس موضوع کو یہاں ہی ختم کرتے ہیں۔

قرآنی نظام آج کی انسانیت کے لئے اہم ترین ضرورت ہے۔ خود مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس کی اہمیت، اس کی ضرورت، اس کے ثمرات کا علم نہیں ہے وہ اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ اور تھیوکریسی میں فرق نہیں کرتے۔ جہاں اور جب اسلامی نظام کا ذکر آتا ہے ہر شخص اس کو تھیوکریسی سمجھنے لگتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس کا قیام اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس نظام کی اطاعت سے عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ نظام کے قائم نہ ہونے کی صورت میں عبادتِ خداوندی کا کوئی اور دوسرا راستہ باقی نہیں رہتا۔ قوانین خداوندی کی اطاعت سے ثواب حاصل ہوتا ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت سے گناہ ہوتا ہے (26:151) یہ ایسی واضح بات ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہر مسلمان اس وقت قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے انحراف کر رہا ہے۔ طاغوتی نظام میں بخوشی زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123)۔ مشہور بزرگ سیاسی کشمیری راہنما سید علی گیلانی نے ایک بیان میں فرمایا ایک مسلمان کا طاغوتی نظام میں زندگی بسر کرنا ایسا ہے جیسے ایک زندہ مچھلی کا پانی سے باہر زندگی گزارنا ہوتا ہے۔

Matrimonial

My son is doctor working with NHS England. He wants to marry a doctor or educationist preferably settled in UK. Or a doctor or Educationist in Pakistan. From Pakistan we will prefer a yousafzai Pathan. Quranic families will be preferred.

0346-9376612

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہو گی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہو گا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہو گا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گرمدغم ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردو بدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.72
ISSUE
11

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/



''اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبنؔ ایک مقام پر لکھتا ہے کہ بحر اٹلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام احوال واعمال کو محیط ہیں اور وہ منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔ اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا، اس دنیا میں مجرموں کی سزا کا سوال ہو یا آخرت کی عقوبت کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطے میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہئے۔''

(تقاریر وتحریراتِ جناحؒ، حصہ دوم، صفحہ:405)